اگر میں زندہ ہوتی

(اوراق ڈائری کے)



شہزادہ سلیم

اگر میں زندہ ہوتی

(اوراق ڈائری کے)

شہزادہ سلیم

نام کتاب	:	اگر میں زندہ ہوتی
مصنف	:	شہزادہ سلیم 7006800415
سائز	:	20x30/16
تعداد	:	500
قیمت	:	350روپے
سنۂ اشاعت	:	2023ء
طباعت	:	TFC پرنٹرس، سرینگر 9419525103
کمپیوٹر کتابت	:	TFC کمپیوٹر، سرینگر 7006575292

تشکر

یہ مختصرسی ڈائری میں نے بڑے حساس انداز میں لکھی ہے اور اس ڈائری کی جتنی بھی جہتیں ہیں اُن پر کہیں نا کہیں میری والدہ مرحومہ کی تعلیمات کا اثر نُمایاں ہے۔ اِس ڈائری کے اختمام پزیر ہونے میں میری اہلیہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔میں دونوں کا شکر گزار ہوں۔میری بہن نے اِس ڈائری کو لکھنے میں مجھے شاباشی دی میں انکا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ہماری CDPO صاحبہ محترمہ حلیمہ بانڈے نے مجھے گھریلو تشدد کے ساتھ وابستہ رکھ کر جس جوانمردی اورخلوص کا اظہار کیا ہے وہ بے شک قابل تعریف ہے۔میں انکا بھی دل کی عمیق گہرایوں سے شکر گزار ہوں۔میری سوپروائزر کلیگ جنہوں نے مجھے اس کام کے دوران بہت ساتھ دیا۔میں انکا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

کچھ خاص شخصیات ہیں جنکا میں اس کام کے لئے بے حد

ممنوں ہوں جن میں صائمہ فرہاد، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ سماجی بہبود یونیورسٹی آف کشمیر۔ محترمہ کونثر رسول، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو یونیورسٹی آف کشمیر ، سہیل سالم ریسرچ اسکولر، عادل اشرف وغیرہ جن کے انمول مشوروں سے میں مستفید ہوا۔

ساتھ ہی سہیل سالم کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی ابتدائی پروف ریڈنگ انجام دی۔ لیکن یہ کام شاید پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا اگر میرے بڑے بھائی فکشن رائٹرس گلڈ کے جنرل سیکریٹری انجینئر شفیع اے، اطہر اس کی پروف ریڈنگ پر آخری مہر نہ لگاتے۔

پیش لفظ

یونیورسٹی کے زمانے میں کئی بار یوتھ فیسٹول میں شرکت کرنے کا موقعہ ملا۔ میں اکثر یونیورسٹی کی ٹیم کے ساتھ جاتا اور یوتھ فیسٹول کا حصہ بنتا۔ یہ میرے شوق و مشغلہ میں کافی حد تک بس گیا تھا۔ ایک تو نوجوانی کا زمانہ جوش اور ولولہ کا ہوتا ہی ہے لیکن غیر نصابی سرگرمیاں جن کو ہم انگریزی میں Extra co-curricular activities یا co-curricular بھی کہتے ہیں میری روح میں جیسے بس گئی تھیں۔ دراصل ان مشغلوں سے انسان کو کافی علمی توسیع تو ملتی ہے ہی دوسری جانب یہ زندگی اور شخصیت میں کافی زیادہ مثبت ردعمل کی عکاسی کرتی ہے۔ ایک بار سن بلوغت میں ایک بڑے براڈ کاسٹر کے ساتھ ریڈیو پر گفتگو کا موقعہ ملا۔ تو ان کے ساتھ بات

کرتے کرتے مجھے اس چیز کا ادراک ہوا کہ ہمیشہ یا تو پڑھتا رہتا ہوں یا پڑھائی کی چیزوں میں آگے بڑھا ہوں۔ بیچ میں انٹرویور نے روک کر ہنستے ہوئے پوچھا ''میاں سلیم لگتا ہے کہ آپ دن کے چاروں پہر پڑھتے رہتے ہو''۔ مجھے بھی اس بات پر بے ساختہ ہنسی نکل پڑی۔ اگرچہ یہ سچائی نہیں تھی۔

کہنا مجھے یہ ہے کہ یوتھ میلہ میں ایک سیکشن ڈرامہ کا ہوتا ہے۔ ایک بار کوئی ایسا ہی فیسٹول گرونا نک دیو یونیورسٹی امرتسر میں تھا اور وہاں ایک ڈرامہ چلا۔ ڈرامے کے آغاز میں ایک چھوٹی سی لڑکی منچ پر آئی اور کہنے لگی ''میں ایک چھوٹی سی ننھی منی لڑکی ہوں اور مجھے پڑھائی لکھائی کا بہت شوق ہے۔ پڑھ لکھ کر میں اپنے ماتا پتا کا نام روشن کرنا چاہتی ہوں''۔ وقت گزرنے کے بعد ڈرامے میں دکھایا گیا کہ لڑکی بڑی ہوتی جارہی ہے۔ اب اسکے انٹرینس کا نتیجہ آنے والا تھا اور سب لوگ یکا یک چہک اُٹھے کیونکہ وہ امتحان پاس کر گئی۔ اب اسکا داخلہ ایک میڈکل کالج میں ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد لڑکی ڈاکٹر بن گئی اور ملک کی جانی مانی سرجن surgeon بن گئی۔ آج 15 اگست کے دن اسکو ملک کے صدر سے ایواڈ حاصل

کرنا تھا کیونکہ اس نے اپنے شہر میں سرجری surgery کے نئے تجربات کیئے کہ ملک کے صدر کو یہ کہنا پڑا کہ اس لڑکی نے اپنی ذہانت سے پورے ملک کا نام روشن کیا۔

اب ڈرامے میں پہلی بار دکھائی ہوئی لڑکی منچ پر پھر سامنے آئی اور بولی ''میں اپنے ملک کا نام ایسے ہی پوری دنیا میں مشہور کر سکتی تھی لیکن جب میں پیدا ہی نہیں ہوئی''۔ اس ایک جملے نے میری کیا ہال میں بیٹھے سارے لوگوں کے پاؤں تلے جیسے زمین کھسک کر رکھ دی۔

ڈرامہ میں کچھ ایسے سین دکھائے گئے جہاں اسکی ماں کا حمل تب گرایا گیا تھا جب یہ لڑکی پیٹ میں ہی تھی اور وہ صرف اسلیئے کیونکہ اسکے بطن میں جو بچہ تھا وہ ایک لڑکی تھی۔ اس ڈرامے نے میرے ذہن پہ کافی اثر ڈالا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا ہم دورِ جہالت سے نکل کر زمانہ جدید کے اس دور میں پہنچ گئے ہیں جہاں لڑکیوں کو زندہ ماں کے پیٹ میں ہی دفنایا جاتا ہے۔

ہم ایک طرف ایک ترقی یافتہ سماج ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دوسری جانب ہماری سوچ پست اور جہالت کی جانب گامزن ہے۔ اس جگہ مجھے عمرانیت کے مشہور ماہر اوگبرن (Ogburn) کی وہ

بات یاد آتی ہے جہاں اس نے کہا تھا کہ ہماری مادی تہذیب سچ مچ آگے بڑھ گئی ہے لیکن ہماری غیر مادی تہذیب اور سوچ وہیں کے وہیں رکی ہوئی ہے۔ اِس ردعمل کو ثقافتی تفرق Cultural lag کہتے ہیں۔

عورتوں کے حق میں بلند بانگ دعویٰ کرنے والے لوگ ہی اکثر عورتوں پہ بے تحاشہ ظلم و بربریت ڈھانے کے حامی ہیں جس میں عورت ہی سرفہرست ہیں۔

غرض گرونانک دیو یونیورسٹی امرتسر کے اس سٹیج ڈرامہ نے میرے دل ودماغ پر ایسی چھاپ ڈالی کہ میں آج تک اس کشمکش میں رہا کہ عورتوں کی حالتِ زار پر میں کب قلم اٹھاوں۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی میں نے عورتوں کی سماجی مشکلات پر چند مضامین انگریزی میں لکھے۔ جبکہ ایک کتاب زیر اشاعت ہے۔ لیکن اردو میں اس موضوع پر میری یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ڈائری کی شکل میں سامنے آرہی ہے۔ اس کتاب سے باقی لوگوں کو فائدہ تو ہوگا ہی لیکن ہماری جو بہنیں اور لڑکیاں پچیس سے پچپن سال کی عمر کی ہے اس کتاب سے کافی مستفید ہوسکتی ہیں۔

اس ڈائری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جن اشخاص کو کہانیاں پڑھنے اور پلاٹ بنانے کا بہت شوق ہے وہ اس کتاب سے ان گنت کہانیاں بُن سکتے ہیں۔

پڑھنے والوں سے گذارش ہے کہ میں چونکہ اُردو کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں اس کتاب کے کمپوزنگ یا املا میں کہیں کہیں کچھ غلطیاں رہی ہوگی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ غلطیوں کو نظر انداز کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

شہزادہ سلیم

انتساب

اُس

صنفِ نازک

کے نام

جس نے مجھے زندگی کا پہلا قدم

اٹھانا سکھایا

....

میں نے کل شب چاہتوں کی سب کتابیں پھاڑ دیں

صرف اک کاغذ پہ لکھا لفظِ ماں رہنا دیا

(منور رانا)

۲۱۔ستمبر۔۲۰۱۹

گھریلو تشدد کی ابتداء بچپن سے ہی ہوتی ہے۔ جب ہمارے نونہال ابھی زندگی کی بہار سے آشناء بھی نہیں ہوتے ہیں، ہم لڑکے کے ہاتھ میں کھلونے کے بطور بندوق جیسا کھلونا اور لڑکی کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھما دیتے ہیں تا کہ لڑکے کی برتری اور بڑائی ظاہر ہو اور لڑکی کی بے بسی بھی سب کی سمجھ میں آئے کیونکہ بندوق سے تو ہمیشہ خوف ہی کھایا جاتا ہے جبکہ گڑیا سے نرمی اور انکساری کی ہی شناخت ہوتی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس قسم کی نفسیات پیدا کی جاتی ہیں کہ لڑکی ہمیشہ اس احساس کے ساتھ سماج میں رہنے لگے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے نیچے تصور کرے اور ہمیشہ نظر جھکا کے کمزوروں کی طرح رہنے لگے۔ اس طرح مردان پر ہمیشہ اپنی برتری جتائے۔

اب یہ جیسے ہمارا تہذیبی ورثہ بن گیا ہے کہ ہم لڑکیوں کے ذہن کو بچپن ہی سے تیار کر کے رکھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ ہی ہمیشہ مشکلات اور مصیبتوں کا سامنا کریں۔ ہماری کچھ ماؤں اور عمر رسیدہ خواتین کے منہ سے تو یہ کلمات بھی نکلتے ہیں کہ بیٹی پرایا دھن ہے۔ اس میں دھن نام کا لفظ ہے یہ اس بات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ہم کس طرح خود ہی سماج میں بیٹیوں کے وقار کو تار تار کرنے کے لئے اڑے ہوئے ہیں۔



۲۴۔ستمبر۔۲۰۱۹

عورتوں کے بارے میں کافی ساری تقریریں سن کرسکول کے دنوں سے ہی دل کو یہ ساری باتیں عام سی لگتی تھیں۔ دل جیسے اُکتا سا گیا تھا۔ لیکن جونہی اللہ تعالیٰ نے میرا نکاح نصیب فرمایا تو مجھے عورت کی عظمت کا اندازہ بخوبی ہوا۔

ایک لڑکی جو پچیس تیس یا پینتیس برس تک اپنے مائکے میں ایک لاڈلی بیٹی کی طرح اپنی زندگی گزارتی ہے وہ یکا یک پہلی رات سے ہی ایک اجنبی گھر کو اپنا سمجھنے لگتی ہیں۔ وہاں کے افرادخانہ سے مل جل کر رہتی ہیں جیسے اسنے کئی برس کا سفران کے ساتھ بسر کیا ہو۔ مرد کے پاس نہ ہی ایسی قوتیں ہیں اور نا ہی اس طرح کی صلاحتیں موجود ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ عورت کے مقابلے میں مرد کتنا بے صبر ہے یایوں کہے کتنا کمزور ہیں۔

ہم عورت کے ایک گھر سے دوسرے گھر تک کی ہجرت پر کافی بحث کرتے ہیں لیکن اس چیز پر علمی بحث نا ہونے کے برابر ہیں۔ مجھے لیکن اس بات کا احساس تب ہوا جب میں نے دیکھا کی میری بیوی ہمارے بچے کو رات کوئی بار دودھ پلاتی ہے جس کا مجھے کبھی کبھی ادراک بھی نہیں ہوتا اور صبح وہی بیوی باورچی خانے میں میرے لئے ناشتہ اور ظہرانہ تیار کرتی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ وہ سوتی کب ہے۔ کبھی کبھار اگر میری نیند کھل بھی جاتی تھی، مجھے پورے دن نا سونے کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن بیوی کے معاملے میں حیران ہوں جو سارا کام نپٹا کر بھی گھر کے باقی افرادِ خانہ کے طعنے سننے کا کلیجہ رکھتی ہے۔

۲۷۔ ستمبر۔ ۲۰۱۹

مجھے پوری طرح یاد ہے کہ جب میں خاں صاحب علاقے میں ڈیوٹی پر فائز تھا تو میرے آفیسر نے مجھے ایک مقالہ لکھنے کو کہا جو اسکو دلی میں ایک کانفرنس میں پیش کرنا تھا۔ مقالہ ایک حساس موضوع پہ تھا اور وہ تھا کشمیر میں بڑھتی ہوئی جنس کی شناخت کر کے بطنِ مادر میں ماری جانے والی بچیوں کا۔ یہ ایک ایسی لعنت تھی جس نے پورے ملک کو اپنے لپیٹے میں لے رکھا تھا۔

اگر ہم کچھ ایسے واقعات کو چھوڑیں جو بیٹیوں کے تقدس میں ابھی بھی ہمارے سماج میں دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو ایک جدید سماج کی دین سمجھتے ہیں لیکن ہماری سوچ اُن درندوں سے بھی گئی گزِری ہے جو اپنے بچوں سے بہ امتیازِ جنس محبت کرتے

ہیں۔ ہم بچپن ہی سے لڑکا اور لڑکی میں امتیاز کرتے ہیں کہ لڑکی بالغ ہونے تک احساسِ کمتری کی شکار ہوئی ہوتی ہے اور اپنی ہی ٹوٹی پھوٹی ذات کے ملبے کے نیچے دبی ہوئی نظر آتی ہے اور پھر کبھی بھی اُٹھ نہیں پاتی ہے۔ اور پھر جب اسکی شادی ہوتی ہے تو اُسے یہ بتایا جاتا ہے سسرال اسکی قبر ہے اور اِسکو کسی بھی طرح اسکو سہن کرنا ہی پڑے گا۔

اب تو ہم لڑکیوں پر ظلم ڈھانے کے معاملے میں اتنی پیش رفت کر گئے ہیں اگر چہ ہم یہ دعویٰ سیاسی اور سماجی طور کرتے ہیں کہ ہم نے عورت کی حالتِ زار کو کافی حد تک سدھارا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ہماری شرحِ جنس اتنی گئی گزری نہ ہوتی۔ اس سلسلے کی سب سے دردناک اور کرب آمیز تصویر ہریانا ریاست کی ہے جہاں مردوں کے مقابلے میں عورت کی شرحِ جنس 828 ہی ہے یعنی کل ایک ہزار 1000 مردوں کی نسبت سماج میں 828 عورتیں ہی پائی جاتی ہے۔

ہماری ریاست جموں و کشمیر بھی اس صف میں آگے ہے۔ یہاں پر عورتوں کی تعداد 923 ہی ہے۔ حالانکہ یہ تعداد باقی

ریاستوں سے بہتر ہے مگر پھر بھی بہت غور کرنے کے لائق ہے۔
حالانکہ ہم اپنے آپ کو ایک اسلامی سماج تصور کرتے ہے جہاں بیٹیوں کی عظمت کو اس طرح بلند کیا گیا ہے کہ باقی کسی بھی فلسفے میں اتنا دم نہیں۔ پھر بھی ہم بیٹیوں کی نسبت اتنے لاپرواہ ہے کہ ہمیں شرم تو نہیں آتی۔

۱۔اکتوبر۔۲۰۱۹

آج مجھے اس بات کا پورا احساس ہوا کہ محض اقتصادی آزادی عورت کی مربوط خوشحالی کی ضامن نہیں ہے۔اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ ایک عورت جو ایک اچھے آفس میں ایک شاندار پوسٹ پہ کام کر رہی ہو لیکن اسکے پاس اسکا بچہ سبھالنے کے لئے گھر میں کوئی نہیں کیونکہ اسکی ساس بچے کو سبھالنے کے لئے تیار نہیں۔اس کی دیورانی کو اس کے آفس جانے کا تعصب ہے کیونکہ وہ خود ایک گھریلو خاتون ہے۔وہ اس لئے حاملہ نہیں ہو پاتی کیونکہ اس پر گھر اور آفس کا بہت دباؤ ہے۔اب وہ ایک گھریلو خادمہ کا سہارا لیتی تو اسے خود اس بات کا ڈر ہے کہ اس کا شرابی خاوند کہیں اس کی خادمہ کے ساتھ غلط رشتہ نہ بنائے۔آفس سے اس کی تنخواہ ماہانہ وصول تو ہوتی ہے لیکن وہ یہ کبھی اپنے آپ پر اپنی خوشی سے خرچ نہیں کر پاتی ہے کیونکہ ATM کارڑ اس کے خاوند کے پاس ہے۔اسلئے یہ بات میں سینہ ٹھوک کر کہہ سکتا ہوں کہ اقتصادی آزادی عورت کی آزادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ خود مختار ہے ہی نہیں۔

۱۱۔ کتوبر۔ ۲۰۱۹

ہمارے سماج میں بہت ساری خواتین بڑے بڑے بنگلوں میں عیش کی زندگی گزارتی ہیں۔ اُن کے یہاں زندگی کی کچھ چھوٹی موٹی الجھنوں کو چھوڑ کر کوئی بڑی اُلجھن نہیں ہوتی۔ لیکن اُن کی انا کی وجہ سے وہ کبھی گھریلو زندگی کا سکون محسوس نہیں کر پاتی۔ یہ بات بھی صحیح ہیں کہ ہمارے یہاں اکثر پڑھی لکھی عورتیں ہی اس انتشار کی شکار ہیں کہ اُنھیں وہ ساری تسکینِ نفسیات دستیاب نہیں ہے جن کی وہ حقدار یا طلب گار ہیں۔ اور یہ خود میں ہی ایک نفسیاتی انتشار ہے جو آخر کار گھر کی کشتی کو ڈبونے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اپنے زمانے کی ایک جانی مانی عورت تھی خوشبو جان۔ محترمہ خوشبو جان اپنے وقت کی یونیورسٹی کی اُن اساتذہ میں شامل ہوتی تھی جو اپنے نرالے انداز سے سٹاف میں ہی نہیں بلکہ طلباء میں بھی خاصی اہمیت کی حامل تھی۔ یہ بات الگ ہے کہ پڑھانے اور تحقیق

میں دوگلے پن کی شکار ضرور تھی۔ وہ ایک رئیس خاندان کی بہو اور ایک پوش کالونی میں رہنے والی پڑھی لکھی خاتون تھی۔ لیکن کیسے پتہ تھا کہ ان بڑے بڑے بنگلوں میں بڑی بڑی اُلجھنیں بھی پنپتی ہیں۔

خوشبو جان اب ریٹائرمنٹ کے دھانے پر پہنچ چکی تھی۔ اب تو اسکی ریٹائرمنٹ میں چھ ماہ سے بھی کم مدت باقی رہ گئی تھی۔ اسی دوران اسکی شادی شدہ زندگی میں بھونچال پیدا ہوا۔ سننے میں آیا کہ یہ لاوا تو شادی کے پہلے دن سے ہی ان کی زندگی میں پنپ رہا تھا جسے ایک نہ ایک دن تو پھٹ کے باہر نکلنا ہی تھا۔

مسلئہ صرف یہ تھا کہ خوشبو جان کو لگ رہا تھا کہ وہ اب اُس شکل وصورت کی مالک نہیں رہی جو وہ شادی کے اُن ایام میں تھی جب اس نے خورشید احمد جو ایک صنعت کار تھے، سے شادی کی تھی۔ اِس وجہ سے خوشبو جان کے من میں یہ سوالات گھر کر گئے کہ اس کا خاوند کسی دوسری عورت کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ یہاں سے خورشید احمد کا کہنا تھا کہ کاروباری دنیا میں اُسے بہت ساری عورتوں سے ملنا جلنا پڑتا ہے اور اسکی بیوی خواہ مخواہ اس پر شک کرنے لگی

ہے۔ جھگڑا اتنا بڑھ گیا کہ خوشبو جان کو اپنے خاوند کی جائداد میں حصہ دلوانا پڑا اور جب ہماری ٹیم خوشبو جان کے سسرال پہنچی تو ایک پولیس والے نے مجھ سے کہا کہ 60 سال کی شادی شدہ زندگی میں اتنی بڑی جائداد کے مالک ہوتے ہوئے بھی اگر انسان اس حد تک پہنچے تو شاید ہماری نسلیں شادی کے بندھن میں بندھنا نہیں چاہیں گی اور یہ لمحہ فکریہ ہے۔

وجہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن یہاں یہ سوال پھر سے میرے ذہن میں رقص کرتا ہے کہ ایک خوشحال گھرانہ، جس میں ضروریات زندگی کی چیزیں نہ صرف میسر ہوں بلکہ بہتات میں موجود ہوں تو دو خوبصورت لوگ جواب ریٹائرمنٹ کے دھانے پر پہنچ چکے ہیں اور ان کے دو خوبصورت بچے جواب شادی کی عمر تک پہنچ گئے ہوں۔ اب جبکہ انکی شادی کرانی مطلوب ہو، ان کے والدین کی شادی ٹوٹ رہی ہے۔ یہ صورتحال کتنی بدقسمتی اور لاچارگی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ سچ مچ انسان بے حد غفلت میں مبتلا ہو گیا ہے!

۰۹۔نومبر۔۲۰۱۹

میں نے محسوس کیا ہے کہ ایک عورت دو چیزوں میں خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کرتی ہے۔ایک تو یہ کہ اُسے اپنی زندگی اور گھر کی بساط مستحکم نہیں نظر آتی ہے اور اُس کو یہ خدشہ رہتا ہے کہ اسکا خاوند ہمیشہ اس کا وفادار نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس کو لگتا ہے کہ اس کا خاوند صرف اسکی خوبصورتی کی وجہ سے مائل تھا جو اب وقت کے ساتھ ساتھ ماند پڑ رہی ہے۔

آنحضور ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں کہا تھا کہ عورتوں کے معاملے میں حساس رہو۔وہی خطبہ ہم میں سے اکثر لوگوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔یا یہ ہمارے تہذیبی کی ایک بہت بڑی خرابی ہے کہ مرد کی پوزیشن عورت کے مقابلے میں ہمیشہ مستحکم اور مضبوط ہے اور یہ ساری ہماری تہذیبی تنزلی کی دین ہو سکتی ہے جسکو ہم راتوں رات بدل نہیں سکتے۔

زبان بھی گھریلو تشدد میں ایک اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔اکثر

ان مقدموں میں ہم نے زبان کو ایک اہم رکاوٹ محسوس کیا ہے جس سے انسان کی حرکات وسکنات میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

عورت نے اس بارے میں خود کے ساتھ بھی ناانصافی کی ہے۔ ہمارے سماج میں مردوں کی جو ذمہ داریاں ہیں عورت انکو خود ہی نبھانا چاہتی ہے۔ جیسے بچوں کی پرورش کی دوڑ دھوپ اُنکا ایڈمیشن، پڑھائی، ڈاکٹر کے پاس لے جانا، ٹیکہ لگانا وغیرہ اور اُس کے لئے خرچا جُٹانے کے لئے نوکری کرنا اور خود اسکی بھی ذمہ داریاں جو مرد کے ذمہ تھی جیسے اس کا اپنا پوشاک، کھانا پینا وغیرہ۔ وہ انکی خریداری بھی خود ہی کرتی ہے۔ یا یوں کہے کہ وہ مرد کی محنت اپنے ذمہ رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہیں تو وہ خود مرد بننے کی کوشش کرتی ہے۔

یہاں پہ جو اسکا اپنا تاریخی رول جیسے کھانا پکانے، گھر سمبھالنے وغیرہ کا ہے وہ اسکو مرد پر نہیں لاد سکتی۔ نا ہی مرد یا سماج اس کو وہ بخش سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دباؤ stress کا شکار ہو جاتی ہے یا گھریلو تشدد کی شکار یا پھر بانجھ پن کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔

☆☆

۱۴۔ نومبر۔ ۲۰۱۹

کل پھر ایک انوکھا قصہ سننے کوملا۔ شاید لو میرتج Love marriage کا یہ پہلا مقدمہ نظر سے گزرا۔ لڑکے کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی۔ سات سال پہلے شادی کے بندھن میں بند چکا تھا ور چھ سال پہلے بچہ بھی ہوا تھا۔ شادی ایک ملازم لڑکی سے ہوئی جو ایک اچھے عہدے پر فائز تھی۔ لیکن لڑکے سے دس سال بڑی تھی۔ عام طور پر ہماری تہذیب میں لڑکا لڑکی سے بڑا ہوتا ہے لیکن اس قصے میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ یہاں لڑکا عورت سے چھوٹا تھا۔

آفس میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ لڑکے نے عورت کا عہدہ دیکھ کر شادی کی ہوگی جبکہ کچھ لوگ تو یہ سمجھتے تھے کہ عورت نے ایک چھوٹے خوب رو لڑکے کے ساتھ اسلیئے شادی کی تا کہ وہ اسکو اپنی اُنگلیوں پہ نچا سکے۔ میرے نزدیک یہ ایک لو میرتج love marriage کا واقعہ تھا۔ عورت کی پہلی شادی ٹوٹ گئی

تھی۔ایک بیس سالہ لڑکے نے کیسے اسکے ساتھ شادی کی جبکہ وہ قانونی طور پر شادی کے لائق بھی نہیں تھا۔لوگ ان رشتوں کو بہت ہلکا لیتے ہیں جو بہت اُلجھنیں پیدا کرسکتا ہے۔مانا لڑکا عمر سے تھوڑا کم تھا لیکن اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ نہ سکے اور اسکے ساتھ تو باقی لوگ بھی شادی کے وقت ساتھ ہوں گے۔تو پھر کیوں لوگ ان چیزوں کو ان دیکھا کرتے ہیں۔سماجیاتی طور لومیریج love marriages اکثر ناکام رہتی ہیں۔

اس کیس میں لڑکے کے گھر والوں نے لڑکی کو بہت ستایا۔زندگی اجیرن بنائی۔قانونی طور لڑکے کو کبھی سزا نہیں مل سکی کیونکہ لڑکی کے گھر والے صرف اسی بات پر بضد تھے کہ انکی بیٹی اسی دن مر گئی جب اسنے لومیریج love marriage کی تھی۔اسطرح لڑکے کو اپنی من مانیاں کرنے کا کافی موقع میسر ہوا حالانکہ لڑکی کا چھوٹا بھائی اسکے ساتھ تھا لیکن لڑکے کا ماما ایک سیاسی کارکن ہوکر ہمیشہ اپنے بھانجے کی طرف داری کرتا رہتا تھا۔جبکہ وہ خود بھی پہلے سے ہی ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔شاید ہم ابھی بھی سماجیاتی حقیقتوں کو عملانے میں ناکام ہی رہے ہیں۔

۱۶۔نومبر۔۲۰۱۹

یہ چیزیں چلتی رہیں۔گھریلو تشدد Domestic violence کے مقدمات کبھی خود ہی خاموش ہو جاتے یا تو عدالت میں طوالت پا کر التوا میں رہتے۔کبھی میاں بیوی کے بیچ صلح سمجھوتہ بھی ہوتا تھا لیکن پھر اُبھر کے ہمارے دفاتر میں آخر کار پیش ہوتے رہتے تھے۔

دھیرے دھیرے ہم نے اپنے دفتر میں گھریلو تشدد کی الماریاں بھری ہوئی دیکھی جن میں سلجھے ہوئے، اُلجھے ہوئے، نئے کیس، پرانے کیس نئے سرے سے کھولے ہوئے مقدمات وغیرہ شامل تھے۔ اور ہمیں ایک سیل cell کھولنی پڑی اور کچھ نئے ملازمین کو یہ کام سونپنا پڑا۔

یہ سلسلہ وار گھریلو تشدد کی کڑیاں خود میں ہزاروں کہانیاں لیکر آتی تھی۔نہ جانے کون سی کہانی سچ پر مبنی تھی اور کس کہانی میں بہتان تھا۔اور کس کی زندگی سے امن چین لے کر آگے بڑھتی۔حالانکہ ایسا

کرنا ہمارے کام کاج پر بھی کئی سوال پیدا کرتا تھا لیکن ہماری تحقیق کی بھی ایک سرحد ہوتی ہے۔ہم خارجی مشاہدات پر ہی کام کرتے ہیں ۔وہ بھی جب ہمیں اس کی ضرورت آن پڑے ۔ ورنہ ہم کاغذات کو دیکھکر ہی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔نہ جانے اندر کیا کیا چیزیں پنہاں اور چھپی ہوئی ہوتی ہے۔سماجیاتی سائنس کی حکمت عملی میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ دل کی دنیا میں اتر کر جھانکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

۳۰۔نومبر۔۲۰۱۹

ہمارے یہاں اگرچہ بیٹیوں کو کافی عزت سے دیکھا جاتا ہے جس کی بہت ساری وجوہات ہیں مگر ایک چیز ہمارے سماج میں بالکل برصغیر کے قبیلوں کی طرح ہی ہے۔وہ ہے تین بیٹوں کے بعد بھی بیٹے کی تمنا کرنا۔آج میں نے ایک عجیب واقعہ سنا۔اصل میں وترہیل مُقام جو بڈگام ڈسٹرک میں واقع ہے، میرا ایک دوست ہلال احمد رہتا ہے۔ایک دن ایک خاص بزرگ کے عرس مبارک پر مجھے ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوئی جو خود کو ایک صوفی بزرگ تصور کرتا تھا۔اُس نے بتایا کہ وہ اپنے ماں باپ کی چھٹی اولاد ہے۔اُسکی ماں کو پانچ بیٹیاں ہوئیں اور اس کے دل میں یہ بات کھٹکتی رہی کہ اس کے ہاں بیٹا کیوں نہیں ہوا۔اِس خیال کو دل میں رکھکر اُس نے اُس زمانے کے مشہور پیر صاحب سے منت کر کے یہ درخواست کی کہ اللہ کے حضور یہ التجا کرے کہ اِس بار بیٹا ہی پیدا ہو۔پیرِ صاحب نے واپس جواب دیا کہ بیٹا تو ہوگا لیکن آپکی جان کو خطرہ ہے۔

ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے اس نے پیر صاحب کو بولا کہ اگر اسکی جان بھی چلی جائے تو اُس کو منظور ہے لیکن باقی عورتوں کے طعنے اسکو منظور نہیں۔ اور وہ ایک بیٹے کے عِوض اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔

اُس آدمی نے بولا کہ بالکل وہی ہوا۔ ایک طرف بیٹا یعنی وہ شخص خود پیدا ہوا اور دوسری طرف اُس عورت یعنی اُس کی ماں کا انتقال ہوا۔ یقین نہیں ہوتا کہ آج کے اس ترقیاتی دور میں بھی اس قسم کی سوچ رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ مجھے میری اہلیہ نے بتایا کہ اکثر جب تین یا چار بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ بیٹا پیدا ہونے کا انتظار پہلے سے ہی ماں باپ نے کیا ہوتا ہے۔

۱۱۔ دسمبر۔ ۲۰۱۹

میں نے آج پوری شدت سے اس بات کو محسوس کیا کہ عورتوں کے تحافظ کے لئے ہر ایک گاؤں میں کم از کم ایک بیتُ المال قائم کیا جائے۔ آج آفس میں رافعیہ نام کی ایک عورت آئی تھی جس کی بات میں نے آفیسر سے ایک ہفتہ پہلے سنی ہوئی تھی۔ تین بیٹیاں جننے کے بعد اسکے شوہر نے اسے گھر سے نکالنے کی دھمکی دی تھی۔ جب ہماری ٹیم رافعیہ کے ساتھ گئی تو وہاں اس کے شوہر نے اسے قتل کرنے کی دھمکی دی اور وہ بھی سارے عملے کے سامنے جس میں ہمارے پولیس افسران بھی شامل تھے۔ میں یہ دیکھ کر کافی حیران ہوا کہ ایک ایس ایچ او SHO کے سامنے ایسی دھمکی دینا نہ صرف ہمارے نفاذی Enforcement ایجنسی کی بھی کھلی اُڑاتا ہے بلکہ انسانی حقوق کی پاسداری کا بھی مذاق ہے۔

رافعیہ کی تین بیٹیاں پیدا ہونے کے بعد اسکے شوہر نے اس کے لئے گھر کا دروازہ بند کردیا۔ وہ بچاری لاچارگی میں اپنی تین بیٹیوں کو ساتھ لائی تھی کیونکہ ایک ماں اپنی اولاد کو الگ نہیں کرسکتی

ہے۔ کتنی لاچارگی اور نفسیاتی انتشار کا عالم ہوتا ہے جب ایک عورت اپنے خاوند کے ساتھ اسلئے نہیں رہ پاتی کہ اسے نفسیاتی تکلیف ہوتی ہے لیکن دوسری طرف اسکے چھوٹے چھوٹے بچے جو اسکے خاوند نے اپنے تحویل میں لئے ہوئے ہوں اور وہ انکی ماں کو اُن سے ملنے کے لئے تڑپا رہا ہو۔ یہ دوسرا نفسیاتی عذاب ہے کیونکہ ایک مرد جانتا ہے عورت کو اپنے بچوں سے دور رکھنا اس عورت پہ کتنا بھاری گزرتا ہے۔

۲۰۔دسمبر۔۲۰۱۹

پرانے زمانے میں یا تو عورتیں اپنے حقوق کے لئے خبردار نہیں تھی یا تو ان میں قوت برداشت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ورنہ اُس زمانے میں بھی ہر زمانے کی طرح گھریلو تشدد کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

پہلی مثال کی عورتیں شرم وحیا کی پاسدار تو تھیں ہی ساتھ میں گھر بنانے میں اُن کا بہترین کردار ہوا کرتا تھا۔ گھر میں باقی افراد کی کھٹ پٹ بھی سننے کو ملتی تھی مگر یہ عورتیں اسکی بھرپائی شاید تب کر پاتی جب وہ خود ادھیڑ عمر کی پہنچ کر دوسروں پر اپنا حق جماتی تھیں۔

دوسری مثال کی عورتیں وہ تھیں، جن کی تربیت پہلے سے ہی شاید اس بات سے شروع ہوتی ہے کہ خاوند ایک عورت کو اگر پیٹے بھی تو اس کو خاموش رہنا ہے کیونکہ وہ اسی لئے بنی ہے۔ یا شاید وہ اپنے مائکے میں غربت کی وجہ سے واپس نہیں جاسکتی۔ یا یہ بھی ہوسکتا کہ مائکے میں رہنا ایک عورت کا ہی دوش مانا جاتا تھا۔ اگرچہ شوہر

ظالم ہی کیوں نہ ہو۔

ایسی عورتیں بے تحاشا ظلم سہتی تھیں اور آجکل کی خبرداری اُن کے لئے کچھ خدا نازل کراماتوں سے کم نہیں۔

ایسی قسم کی عورتیں پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ان کو اپنے حقوق بالکل پتہ نہیں تھے۔وہ پوری عمر سسرال کو ہی اپنا مقدر سمجھتی تھیں۔لیکن یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ اس طرح کی طرز زندگی کو لیکر اُس کے گھر اور پورے سماج میں ایک امن قائم ہو جاتا تھا۔اس کے بچے خاص کر ایک امن والی اور سکون سے بھری زندگی گزارتے تھے اور کبھی کبھی انکو اپنے باپ کے مظالم پتہ بھی نہیں چلتے تھے۔

لیکن اس سب کے بیچ میں اگر کوئی پستی تو وہ ایک عورت ہی تھی جو ایک ملبے کی ڈھیر کی طرح پوری عمر سسرال کے باغیچے میں پڑی رہتی اور سب کی نظروں کے سامنے ہو کر بھی سب سے اوجھل رہتی تھی۔

۲۲۔دسمبر۔۲۰۱۹

راستے اور بھی آسان ہونے لگے لیکن منزل بہت دور نظر آرہی تھی۔یا یوں مانئے آنکھوں سے اوجھل۔آفس میں مقدموں کے انبار جمع ہونے لگے۔ہم اگر اپنا باقی کام چھوڑ بھی دیتے تو بھی سنبھال نہیں سکتے تھے۔ہر دن ایک نئی کہانی۔اب تو میری بیوی کہانی سنتے سنتے تھک گئی تھی۔یہی ایک موقعہ ہوا کرتا ہے کہ آدمی جو دن بھر کرتا ہے اسکی چھاپ اکثر اسکے دل و دماغ پر پڑتی ہے اور وہ اکثر انہیں چیزوں کو دہراتا پھرتا ہے لیکن اگر چیز منفی ہو تو کبھی کبھی اسکا منفی اثر بھی دل و دماغ پر پڑتا ہے۔اب تو نتیجہ یہ ہوا کہ جب بھی میں اپنی بیوی کے سامنے اپنے حقوق کی ترجمانی کرتا خواہ وہ مسکراتے لہجے میں ہی سہی، اسکو لگتا تھا کہ میں گھریلو تشدد سے متاثر ہوکر کہہ رہا ہوں۔

یہ کہانیاں اکثر ہمارے معاصرین کو اچھی تو لگتی تھیں مگر ان میں کوئی بھی حل دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔اگر چہ ہمارے محکمہ میں زیادہ تر مستورات ہی کام کرتی تھیں۔

۳۱۔دسمبر۔۲۰۱۹

ایسے مقدمے صرف کسی خاص صورتِ حال کی عکاسی ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ سماج کے ایک بڑے کینواس کو تار تار کرنے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں اور ایسی وبائی صورتحال کو جنم دے رہے ہیں جس کا قلع قمع کرنا بہت دشوار تو کیا ناممکن دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اس لئے کیونکہ شادی اور خاندان سماج کے دو اہم ستون ہیں۔ کچھ سال پہلے جن چیزوں کے تصور سے دل گھبراتا تھا آج وہ گھر گھر کی کہانی بن گئے ہیں۔ جہاں منشیات، شراب نوشی وغیرہ سماج میں نوجوانوں کو اپنا نشانہ بنا کر اندر ہی اندر کھوکھلہ کر رہی ہے۔ وہی انسان کی انا (Ego) اس کے رشتوں میں آکر انسان کو اللہ تعالی کے بنائے ہوئے نظام اور خاندانی میل ملاپ کو ملیا میٹ کر رہی ہے۔ اگر سماج کی پاسداری کرنی مطلوب ہو تو ہمیں شادی

اور خاندانی تصور میں امن پیدا کرنا ہوگا۔ کیونکہ جب انسانی رشتے مستحکم ہونگے تب ہی ایک صحت مند سماج کی بنیاد رکھی جا سکتی ہیں۔ شادی اور خاندان انسانی سماج کے وہ دو پہلو ہیں جن کے بغیر انسان کی بقا قائم نہیں ہوسکتی۔ شاید اسی لئے دنیا کے ہر ایک مذہب نے شادی جیسے پاک رشتے اور گھریلو زندگی کی سرگرمیوں کو جہاد سے تشبیح دی ہے۔

ہمارے ذمہ جو کام تھا اب وہ کام بہت اثر پذیر ہورہا تھا اور گھریلو تشدد کے مقدموں کے عدالتی سفرنامے اور ہمارے آفس سے لئے ہوئے اقتباسات جو قانونی کاغذات کے ساتھ رکھنے لازمی قرار دئے گئے تھے ہر ایک الماری میں نظر آنے لگے۔ حالانکہ میڈم جی کی توقعات کی لاج رکھکر میں نے اپنی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کر کے اس ردعمل کو آسان بنانا چاہا۔ اور اب ہم سب کو الگ الگ تفویض assignment ملا اور میرے سب ساتھی یہ دیکھ کر بہت حیران اور پریشان بھی ہوئے کہ میں آفس میں رہتے ہوئے کتنا بڑا آفس اندر ہی اندر چلا رہا تھا۔

اس بات کا اندازہ انہیں اس بات سے ہوا جب وہ کچھ ہی

دنوں میں مقدموں کی بہتات کو دیکھ کر دن بدن کام کا بوجھ محسوس کرنے لگے۔ میں ایسا قطعی نہیں چاہتا تھا لیکن میں اندر ہی اندر دباؤ محسوس کرنے لگا تھا۔ اگر اکیلا ہی ان مقدموں کو سنبھالتا رہتا تو میرے ذہن پہ کافی تناؤ تو تھا ہی ساتھ ہی ساتھ باقی کام جو میرے ذمے تھے وہ بھی متاثر ہوتے۔ ساتھ ہی ساتھ گھریلو تشدد جیسے حساس کام کو اثر پذیر ہونا پڑتا۔

۱۲۔جنوری۔۲۰۲۰

وہ ایک ذہین لڑکا تھا۔جب میں اندر آیا تو میڈم جی کان لگا کر بلکہ دل کی گہرائیوں سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔اس نے بولا کہ وہ آئی۔اے۔ایس (IAS) کا امتحان پاس کرنا چاہتا ہے۔اپنے بھائی بہنوں میں سب وہ سے بڑا ہے۔دوبار (IAS) کا امتحان پہلے ہی دے چکا ہے۔اب تیسری باری میں بالکل پُر امید نظر آرہا ہے۔جونہی میں اندر آیا میڈم جی نے میری جانب مخاطب ہوکر بولا، ''سلیم صاحب اب آپ بھی ان کی رُداد سنئے''۔میں پہلے سے ہی اس کی باتوں سے متاثر ہونے لگا تھا اور مجھے اپنے معاصرین کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ متاثر ہیں۔

میں نہ صرف اسکی ظاہری شخصیت اور کپڑوں کے ڈھنگ سے کافی متاثر تھا بلکہ اس کے خیالات نے میرے دل میں الگ ہی کیفیت پیدا کی تھی۔''سر پہلے میری بات سنیں۔مجھے امتحان کے

لئے تیاری بھی کرنی ہے، وہ بولا'' ۔''اُس کی تیاری بھی بیٹا میں کرادوں گا آپکو، آپ فکر مت کرو، میں نے بولا''۔

میرا یہ کہنا تھا کہ میرے معتبر ساتھیوں نے مسکرا کر کہا ''آپ صحیح جگہ اور صحیح شخص سے مل رہے ہے''۔میڈم جی نے میری طرف ٹھنڈی آہ لیکر کہا کہ کیسے کیسے گلاب وقت کی تپش سے مرجھانے لگتے ہیں ۔ایک طرف وہ لڑکا ہمیں اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے میں مست تھا جو اس نے اپنے دادا کی میڈیکل نوکری کے تجربات سے حاصل کئے تھے اور کچھ اپنی قابلیت کی بنیاد پر، اور دوسری طرف ہم سوچ رہے تھے کہ اس نے چھوٹی عمر میں ہی اپنے والدین کے گھریلو تشدد کی آندھی کو کیسے سہا ہوگا۔

کچھ لوگوں کو بچوں کی کتنی تمنا ہوتی ہے اور کچھ لوگ سنبھال نہیں پاتے تو مجھے اپنی ماں کا مقولہ یاد آیا کہ 'اڈین ارمان تہِ اڈ پشیمان' یعنی کچھ کے پاس سونا تو ہوتا ہے مگر کان نہیں ہوتے ہیں اور جن کے پاس کان ہوتے ہیں انکے پاس سونا ہوتا ہی نہیں۔

۱۳۔جنوری۔۲۰۲۰

بات بالکل عام فہم ہے لیکن فطرت کے خلاف، عورت چونکہ شادی کے بعد جسمانی طور ایک حیاتیاتی کشمکش میں لگ جاتی ہے۔ اسلیئے اسکے جسم میں بناوٹ کے لحاظ سے ایک گراوٹ سی محسوس ہونا ایک فطری عمل ہے۔دوسری طرف مرد کے جسم میں شادی کے بعد کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں آتی۔اسلیئے عورت کے شعور میں یہ بات کہیں سے داخل ہوگئی ہے کہ اس کا خاوند ہمیشہ اس سے حسین و جمیل لڑکی کی تلاش میں بھٹک سکتا ہے۔دوسرے لفظوں میں عورت احساسِ کمتری کی شکار ہو جاتی ہے جو بعد میں ایک مسلسل نفسیاتی بے چینی یا مرض کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔

اگر یہ سلسلہ یونہی قائم رہا تو عورت کی نفسیات خود ہی گھر کو یا یوں کہے ایک خوشحال گھرانے کو جہنم کا ایندھن بنا سکتی ہے جس میں

وہ خود ہی جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ایک ایسا ہی مقدمہ ہمیں جان اختر کی شکل میں موصول ہوا۔ جان اختر پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاندانی عورت بھی تھی جس کی شادی اپنی عمر سے زائد ایک آدمی سے ہوئی۔ آدمی چونکہ میڈیا میں کام کرتا تھا اسلیئے اسے اکثر مختلف ریاستوں کے سفر کا موقع ملتا جہاں بہت ساری عورتیں اکثر اسکی ٹیم میں داخل ہوتی رہتیں۔ وقت گزرتا گیا اور جان اختر کی دو اولادیں بھی ہوئیں۔ اللہ نے انکو دو خوبصورت بیٹیوں سے نوازا جن کا داخلہ شہر کے مشہور ا سکول میں کیا گیا۔ محمد لطیف جو جان اختر کے شوہر تھے، نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کثر نہیں رکھی۔ پھر کیا تھا زندگی کے ایک موڑ پہ جان اختر کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اسکا خاوند چونکہ ملک کی بہترین عورتوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، ان میں دل چسپی لینے لگا ہے اور وہ اب اپنے شوہر کے لئے بیکار ہو چکی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سوچ کے پیچھے اور بہت سارے محرکات بھی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ شکوک و شبہات بھی ہوں لیکن دراصل یہ عورت کی نفسیاتی الجھن ہے جو ایک بہت بڑی گھریلو الجھن بن جاتی ہے۔ یہ جھگڑا

اتنا بڑھتا گیا کہ جان اختر ایک دن ہمارے آفس میں اپنے عدالتی مقدمے کے سلسلے میں آئی جو اسنے اپنے ہی شوہر محمد لطیف کے خلاف دائر کیا ہوا تھا۔

مجسٹریٹ کے آرڑر کے مطابق جان اختر کو اپنے خاوند کے جائداد میں حصہ دلانا لازمی تھا۔ وہاں سے جان اختر کے شوہر کو اپنی بیوی کے اس برتاؤ پر تعجب بھی تھا اور رنج بھی لیکن وہ اس صورتحال میں جیسے پھنس سا گیا تھا۔

۰۹۔فروری۔۲۰۲۰

آج اسنے مجھے پھر فون کیا۔دراصل اس نے ریڈیو پر میرا پروگرام سنا تھا جسمیں میں نے کچھ سکیمس (Schemes) کا ذکر کیا تھا ۔بس وہ اتنا متاثر ہوگئی تھی کہ اسنے مجھے پروگرام ختم ہوتے ہی فون لگایا اور تیز سانس میں مجھ سے کہنے لگی کہ وہ میرا پروگرام سن کر کتنی خوشی محسوس کر رہی تھی اور وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ میں اسے فوراً ان سکیمس میں اندراج کراؤں تا کہ وہ انکا فائدہ حاصل کر سکے۔

میں من ہی من یہ سوچ رہا تھا کہ ثریا کتنی معصوم ہے۔شاید اتنی ہی معصوم اسکی زندگی کی گھریلو تشدد کی وہ کہانی بھی ہے جو کسی کا بھی دل دہلا سکتی ہے۔ثریا ایک خوبصورت جوان لڑکی تھی لیکن دو بچے جنم دینے کے بعد ہی بیوہ ہوگئی تھی۔اب ہونا کیا تھا کچھ ہی مہینوں کے بعد ہی ثریا کی دوسری شادی اس کے گھر والوں نے ایک ادھیڑ عمر کے رئیس آدمی سے کر دی جس کی بیوی کچھ سال پہلے گزر گئی تھی اور اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ اپنی بیٹی اور بیٹے کا خیال نہیں رکھ پاتا

تھا اور شاید اسے ایک خادمہ care taker کی ضرورت تھی لیکن ثریا نے کبھی بھی ان بچوں کو اپنے بچوں سے الگ نہیں سمجھا اور انکو حد سے زیادہ پیار دیا جب تک وہ بڑے ہو گئے۔ پھر کیا ہونا تھا بڑے ہو کر ثریا کا ایک لڑکا ایک اچھے عہدے پر فائز ہوا اور دوسری لڑکی کی بھی شادی ہوئی۔ ثریا کے اپنے بچے ابھی تھوڑے چھوٹے تھے۔ تاہم اب اسکی بہو نے یہ سوالات پیدا کئے کہ وہ ایک سوتیلی ساس کے ساتھ کس طرح گھر میں رہ سکتی ہے۔ اور ثریا پہ یہ الزام تراشی ہونے لگی کہ وہ ایک لالچی عورت ہے جس نے ایک مالدار مرد کے ساتھ شادی اسکا مال ہڑپ کرنے کے لئے کی تھی۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا گیا کہ ثریا کو اس کے گھر سے نکالا جائے اور یہی ہوا بھی۔ ثریا کو گھسیٹ کر اپنے ہی گھر سے بے دخل کیا گیا۔

۱۱۔فروری۔۲۰۲۰

اس سلسلے کی دوسری کڑی صدف ہے جو نوجوان اور پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ کافی خوبصورت بھی ہے۔اسکا والد شہر کا ایک نامی گرامی وکیل ہے۔

صدف کی شادی عامر سے ہوئی جو ایک رئیس زادہ تھا لیکن صدف سے تھوڑا کم پڑھا لکھا۔صدف اور عامر کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی تھی۔اللہ نے انہیں ایک فرزند سے بھی نوازا۔لیکن کچھ سال بعد ہی پتہ چلا کہ عامر کا کسی لڑکی سے جو شاید اسکی ہی کمپنی میں کام کرتی تھی' کچھ چکر ہے۔جب تحقیق کی گئی تو یہ سچ پایا گیا۔لڑکی پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بہانے مختلف شہروں کی سیر کرتی رہتی وہ بھی عامر کے ساتھ جو کہ کئی کمپنیوں کا مالک تھا۔بھلا اس کو دوسری ریاستوں میں جانے سے کون روک سکتا تھا۔اسی بہانے دونوں دوسری ریاستوں میں اچھی طرح گھوم پھر لیتے تھے۔

معاملہ تب طشت از بام ہوا جب صدف کے بابا نے جو ایک وکیل تھا نے خفیہ طور یہ پتہ لگایا کہ اسکے داماد کا کیا چکر چل رہا ہے۔اب جبکہ سب پتہ چل گیا تھا صدف کا پیار عامر کے لئے کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا لیکن دوسری طرف وہی صدف اپنے محبوب کی زندگی میں کسی دوسری لڑکی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اگر خاوند کا شادی کے بعد کسی دوسری عورت کے ساتھ چکر ہو گیا تو عورت اپنی محبت لے کر کہاں جائے۔ یہاں یہ بات بھی صحیح ہے کہ کورٹ کچہری میں شاید سب مل سکتا ہے لیکن کھوئی ہوئی محبت کبھی واپس نہیں مل سکتی۔

۱۴۔فروری۔۲۰۲۰

اقرا جس کا اصل نام انجلی دہلی کی ایک باعزت خاتون تھی جس نے ایک کشمیری آدمی سے اُسکے عشق میں پاگل ہوکر شادی کی تھی۔جس کی وجہ سے اسے اپنا مذہب بھی تبدیل کرنا پڑا اور وہ مسلمان ہوگئی۔اس آدمی کا نام خالد تھا اور شاید اسکی پہلی بیوی بھی تھی جسکو اسنے چھوڑ دیا تھا۔حالانکہ اقرا کو اس بات کا پتہ بھی چلا تھا لیکن اس بات سے اقرا کے دل کو کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ وہ خالد سے سچا پیار کرتی تھی ۔اس کے برعکس خالد نے اپنی بیوی کا مذہب تبدیل کر کے اس سے یہ فرمائش کی کہ وہ اپنا سارا سونا اسکے حوالے کردے تا کہ وہ کشمیر میں ایک مکان خریدے اور وہ دونوں چین سے ساری زندگی اس مکان میں گزار سکیں۔لیکن خالد نے وہ مکان اپنے نام سے اندراج کردیا تھا۔

اقرا نے جب یہ کہا کہ اسے افسوس ہے کہ وہ مسلمان ہی کیوں

بنی تو ہمارے دل ودماغ کو اندر سے جیسے ٹھیس لگی۔ جبکہ وہ تیکنکی طور پر وہ یہاں کی باشندہ نہیں تھی۔ اسی لئے پہلے ہم نے اس سے ایک ڈومسائلDomicile سرٹیفکٹ طلب کی۔ کچھ ہی دنوں میں اقرا کے کیس کو تیز رفتار Fast track موڑ پہ رکھ کر یہ ثابت کرنا پڑا کہ ایک انسان کی غلطی سے پورے قوم کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا اچھی بات نہیں ہے۔

۲۷۔فروری۔۲۰۲۰

وہ ایک شیعہ لڑکی تھی جس نے ایک سُنی لڑکے ساتھ گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔لیکن دو لڑکیاں ہونے کے بعد اُس کے خاوند کو اپنی بیوی سے جی بھر گیا اور گاؤں والوں کے سامنے اپنی ہی بیوی کو یہ کہہ کر نیچا دکھایا کہ وہ بد چلن ہے۔دراصل وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا اور وہ بھی اپنی پچیری بہن کے ساتھ۔

جب ہم نے شفقت کو پہلی بار دیکھا تو اسکی گود میں ایک تو نو مہینے کی اور ساتھ میں پانچ سالہ بچی تھی۔شفقت ایک جوان لڑکی تھی لیکن بے بسی اور بے کسی نے اسکو پوری طرح سے گھیر لیا تھا۔وہ جاتی تو کہاں جاتی۔وہ ایک شیعہ تھی اور جب اسنے اپنی مرضی سے سنی لڑکے کیساتھ شادی کی تھی تو مائکے والوں نے اسکو گھر سے بے دخل کیا تھا اور اب سسرال والے بھی اسکو تسلیم کرنے سے قاصر تھے۔

جب ہم پولیس پارٹی لیکر شفقت کے سسرال گئے تو وہاں ہمیں وہی جواب ملا جو ہمیں اکثر موصول ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شفقت کے سسر نے کہا کہ وہ پراپرٹی اُس کے خاوند کے نام پر نہیں بلکہ خود سسر کے نام پر ہے۔ اسلئے وہ اسے منتقل نہیں کرسکتا۔

متاثر کرنے والی چیز یہ تھی کہ شفقت نے دس دسمبر، جو جھاڑے کی سرد ترین رات تھی' ایک سڑک پر اپنی دو معصوم بچیوں کے ساتھ گزاری تھی۔ اور سماج سوتا رہا اور شاید آج بھی سویا ہی ہوا ہے۔

۱/ مارچ ۔۲۰۲۰

ایک ماہر سماجیات سے میں نے جب یہ پوچھا کہ لڑکیاں کیسے خود کفیل محسوس کر سکتی ہے۔ اُن کا بے ساختہ جواب تھا کہ اگر شادی سے پہلے ہی باپ یا بھائی اسکا حق ادا کرے یعنی اپنی جائداد میں اُن کو اپنا حصہ دے دیں۔ پھر میں سوچ میں پڑ گیا کہ کتنے گھروں میں ایسے باپ اور بھائی ہونگے جو خود کو دین دار تصور کرتے ہیں لیکن انہوں نے آج تک لڑکیوں کو حصّہ دینا تو دور حصّہ دینے کا سوچا بھی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود کو بیٹیوں کے ہمدرد، غمگسار اور سماج کے ٹھیکیدار کہتے ہیں۔

آخر ہم اپنی بیٹیوں کو جائداد میں حصہ دینے سے کیوں قاصر ہیں۔ جب کہ ہم خود اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ بیٹیاں بیٹوں سے زیادہ وفادار ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لڑکیوں کو حصہ دینا کیسے گھریلو تشدد کو کم کر سکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو خاوند کے

نکالنے پر اگر ایک لڑکی کو کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ ہے ایک مکان یا اگر ایک خاوند اپنی بیوی کو دباؤ میں لاسکتا ہے تو وہ اسکی بے بسی اور بے کسی کی بات کو نظر میں لاتا ہے تو وہاں روٹی، کپڑا اور مکان ہی کی بات ہوتی ہے۔ اگر لڑکی اپنے انا کو چھوڑے تو اسے جس چیز کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ ہے سر چھپانے کی اور اگر اسے اسکا حصہ پہلے ہی دیا جائے تو خاوند کے پاس ایسا ہتھکنڈا شاید نا ہو کہ وہ عورت کو کمزور اور لاچار سمجھے اور اُسکی بے بسی کا فائدہ اٹھائے۔

۶/مارچ۔۲۰۲۰

اسلام نے بحث کو بالکل الٹا کر کے دکھایا ہے جس کو ہم انگریزی میں Paradiagm shift کہتے ہے۔اس سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ جس کے یہاں لڑکا ہوگا وہ اسے جہنم کی آگ سے بچا سکتا ہے لیکن مذہب اسلام نے دنیا کی پوری کایا ہی پلٹ دی۔اسلام اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ جس کی دو لڑکیاں ہوں وہ جنت میں جائے گا۔دو سے مراد ایک سے زائد۔اس کا مطلب نہیں ہے کہ ایک لڑکی والے کا کوئی جواز یا حصہ نہیں۔بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ جتنی زیادہ لڑکیاں ہوں، آپ کے درجات اُتنے ہی بلند کر دیئے جائیں گے بشرطلہ آپ نے ان کی پرورش صحیح معنوں میں کی ہوگی۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ماں باپ کے آڑھے وقت میں اگر کوئی کام آتا ہے تو وہ ہے ایک لڑکی جو ماں باپ کے ساتھ کبھی بھی کوئی بے وفائی نہیں کرتی۔ماں باپ کے برے وقت میں لڑکے شاید انکو تنِ تنہا چھوڑ سکتے ہیں لیکن یہ ایک لڑکی ہی ہوتی

ہے جو کبھی بھی انکا دامن نہیں چھوڑتی ۔ ماں باپ کے اس دنیا سے جانے کے بعد بھائی آپس میں پراپرٹی سے اپنے حصے کی بات کرتے ہیں لیکن یہ ایک لڑکی ہی ہوتی ہے جو ماں باپ کے مرنے کے بعد اُن کی یاد کو سینے سے لگاتی پھرتی ہے۔

عورت ماں کے روپ میں سراپا رحمت، بہن کے روپ میں عمر بھر کی ساتھی، بیوی کے روپ میں شریک حیات اور ایک بیٹی کے روپ میں باپ کی ایک بہترین ساتھی تصور کی جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اپنی بیٹیوں سے محبت کرو کیونکہ وہ آپ کی بہترین ساتھی ہیں''۔

"Love your daughters as they are your best companions"

جنم لیتے ہی ماں کی ممتا اور سمندر سے بھی گہرے جذبہ ایثار کی گود میں انسان پرورش پاتا ہے جس پیار کا دنیا میں کوئی بھی ثانی نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی چھاؤں ہے جو اولاد کو اپنی آغوش میں لیکر زندگی کی ہر دھوپ سے محفوظ رکھتی ہے اور بدلے میں کسی بھی چیز کی امید نہیں کرتی ۔ ماں کی ممتا انسان کو مرنے کے بعد بھی ساتھ رہتی ہے کیونکہ اس جیسا انسان دنیا میں پھر کسی کو نہیں پاتا۔ ماں کی ہی

پر چھائی جیسی بہن ہوتی ہے جو انسان کا ساتھ ہر مرحلے میں نبھاتی ہے اور اسکے دکھ درد میں اس کو حوصلہ بخشتی ہے۔ پھر نمبر آتا ہے شریکِ حیات کا جو ایک انسان کی مشیر ہوتی ہے اور وہ کہتے ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ عورت اسکی بیوی ہوتی ہے اور جب ایک بیٹی کی بات کی جائے تو دل میں ایک ایسی رفیق اور شفیق ساتھی کی جھلک سامنے آتی ہے جو کبھی بھی اپنے باپ کا سر نیچا نہیں ہونے دیتی۔ جس انسان نے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کا پیار دیکھا ہو اور محسوس کیا ہو تو شاید اُس کو دنیا میں کسی اور کے پیار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ساتھ ہی اس کا دل ہمیشہ مطمئن رہتا ہے۔

۱۳۔ مارچ۔ ۲۰۲۰

گھریلو تشدد کے قوانین کی جو ترمیم ہوئی وہ گھریلو تشدد ایکٹ (Domestic Violence Act 2005) کے طور پہ وجود میں آیا۔ اس قانون میں ایک اہم رول پروٹکشن آفیسر (Protection Officer) کا ہے ۔یہ نہایت ہی اہم اور حساس رتبہ ہے ۔یہ ICDS یعنی (Integrated Child DevelopmentScheme) جو بچوں اور عورتوں کی بہبود پہ محکمہ وجود میں آیا ہے، کی تحویل میں دیا گیا ہے اور بہت اچھا ہوا کیونکہ سماجی بہبود کا محکمہ سماج کے بہت قریب ہوتا ہے۔ محکمہ کی آئی۔سی۔ڈی۔ایس ICDS شاخ میں ہزاروں آنگن واڑی ورکرس اور سینکڑوں سوپروائزریس فائز ہیں جو دن رات سماج کی خدمت کر رہے ہیں۔ جب بھی کبھی گھریلو تشدد کا کیس موصول ہوتا ہے، آنگن واڈی ورکرس کی مدد سے سوپروائزریس صاحبان معاملے کی تہہ تک جاتے ہے۔اور بڑی باریکی سے ہر ایک زاویہ کو مدنظر رکھ کر دیکھتے ہیں۔ یہ کیسس جوڈیشل مجسٹریٹ شاید ہی اتنی باریکی

سے دیکھ پاتا ہے۔

ہمارے پاس کئی کیس سٹیڈیز (Case studies) بھی موجود ہے جن کو سوپروائزریس نے بڑی باریکی سے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار معاملے کی تہہ تک جا کر دیکھا۔ کئی بار تو کچھ مقدموں کی نوعیت ہی بدل گئی اور سارے ذمہ داران یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ سپریم کورٹ نے یہ ذمہ داری کیسے پروٹکشن آفیسر کو دے دی۔

۱۷۔مارچ۔۲۰۲۰

اپنی زندگی کے گزشتہ سالوں میں آفیسر حلیمہ بانڈے جی سے میری ملاقات ہوئی۔وہ ایک انتہائی ادب یافتہ اور ایک اعلیٰ ذہانت کی مالک خاتون ہے۔

وہ بھی ایک عورت ہے لیکن انکی آزادانہ سوچ، جوش اور ولولہ، اور اپنے ملازمین کے عوض گھریلو جیسا برتاؤ نے حلیمہ جی میں ایک بہترین آفیسر کے جیسی ساری خوبیاں پیدا کی ہیں۔

انہوں نے ایک عورت ہو کر کبھی بھی گھریلو تشدد کے مقدموں کو عورت کی نظر سے نہیں دیکھا۔لیکن جہاں ایک عورت کی عظمت اور اُس کا جینا خطرہ میں ہو تو حلیمہ جی نے کبھی بھی لحاظ نہیں کیا۔

یہ بات اس سے بھی عیاں ہے کہ جتنے بھی لوگوں اور پارٹیوں نے ہمارے دفتر کا رخ کیا اور ہماری کونسلنگ سے اپنی سوچ کو سنوارا۔اُن سب سے زیادہ اگر ہم نے کسی کو موثر پایا اور جنکو

ہماری رپورٹ نے فائدہ پہنچایا، وہ اکثر مرد حضرات ہیں۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ مردوں کی طرف داری ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے کام کی خوبصورتی ہے کہ جس کے لئے یہ قانون بنایا گیا ہے، وہاں اسکے برعکس لوگوں کی حمایت بھی ہوسکتی ہے۔

۲۱۔ مارچ۔ ۲۰۲۰

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میری آفیسر نے مجھے رخسانہ حمید کا کیس دیکھنے کے لئے کہا تھا۔ پہلے تو میں تھوڑا حیران ہو گیا کیونکہ سماجی بہبود میں کسی گھریلو تشدد کا کیس سننے کو پہلی بار ملا تھا اور ہم لوگ ان چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے او جب رخسانہ کا مقدمہ میری نظر سے گزرا، میری نظر سے جنسی تشدد، نفسیاتی تشدد جیسی کچھ عبارتیں گزری جن کو میں نے آج تک صرف کتابوں یا کہانیوں میں دیکھا یا پڑھا تھا۔ چونکہ میرے پاس سماجیاتی علم کی ڈگری پہلے سے ہی تھی لیکن آج میں براہ راست کچھ ایسی عبارتوں کا مشاہدہ کر رہا تھا جنکو پڑھ کر مجھے اپنی یونیورسٹی کے کلاس روم میں بتائے ہوئے دن یاد آئے۔ میری شخصیت ایسی ہے کہ میں اپنے کام کو تنخواہ کے حدود اور میرے کام کی خاصیتوں، دائروں اور سانچوں میں کبھی بھی تصور نہیں کرتا بلکہ میں ہمیشہ آفس کی حساس چیزوں کو اپنے مطالعہ اور علم کی وسعتوں میں سمیٹنا چاہتا ہوں یا یوں

کچھ سیکھنا چاہتا ہوں تا کہ میرے علم میں اضافہ ہو۔ بھلے ہی مجھے اس میں پوری عمر لگ جائے مگر شرط یہ ہے کہ یہ میری چاہت کا مرکز ہونا چاہئے حالانکہ جو کام شروع کیا اسکو شاذ و نادر ہی پورا کر پاتا ہوں لیکن گھریلو تشدد جیسے موضوعات اور اسکی وسعتوں نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے عورتوں کی رکاوٹوں اور مشکلات پر لکھی گئی کافی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا ہے۔

۲۳۔مارچ۔۲۰۲۰

میری بیوی اکثر مجھے کہتی ہے کہ میں سمجھدار نہیں ہوں۔مطلب مجھ میں understanding کا فقدان ہے۔اگر غور کیا جائے تو بات سہی ہے۔زندگی کے مخصوص اوقات life events میں میری بیوی نے کافی understanding کا مظاہرہ کیا ہے۔اب مسلئہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ misundersanding کن وجوہات سے پیدا ہوتی ہے۔اگر دیکھا جائے تو بہت ساری سماجی غلطیوں سے جو اہمیت میں تو بہت چھوٹی دکھتی ہیں لیکن معنی میں بہت بڑی ہوتی ہیں۔انہی سب چیزوں سے اکثر غلط فہمیاں misunderstanding پیدا ہو جاتی ہیں۔

مرد تھوڑا قدرتی طور Aggressive ہوتا ہے۔میں عورتوں کو یہ نہیں کہتا کہ آپ مرد کے غصے کو برداشت کرو لیکن معاف بھی تو کیا جا سکتا ہے۔فقط اس کی کمزوری اور بے بسی سمجھ کر۔سائنس بھی یہ بات سر کر گئی

ہے کہ جذباتی طور عورت مرد سے کافی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔
بس بات صرف اتنی ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کی کمزوری کو ڈھانپ لے جو اللہ کا بھی حکم ہے تو بات آگے بڑھنے سے کسی حد تک روکی جا سکتی ہے جس میں اللہ کی خوشنودی بھی شامل حال رہے گی۔

۲۷۔ مارچ۔ ۲۰۲۰

بھاگ دوڑ والی زندگی نے انسان کو مادیت کا غلام بنا دیا ہے۔انسان زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کی کوشش میں لگ گیا ہے۔ اِس معاشرے میں عورت بھی مادیت کی فکر مند ہو کر مرد کے شانہ بہ شانہ میدان میں کود پڑی ہے۔

آج ہمارے پاس گھر میں بزرگوں کے بغیر کوئی نہیں ہے۔یہاں سے عورت کے رول جو اُس کو صدیوں سے اپنے سماج نے دئے ہیں جیسے کہ کھانا پکانا، بچوں کی پرورش وغیرہ بھی کرنے ضروری ہیں۔اس چیز کی طرف توجہ کم ہورہی ہے۔اب عورت بے بس ہے کہ وہ باہر کا رول نبھائے یا اندر اپنے گھر کے کام کرے۔ اپنے آفیسر کا مانے یا اپنے خاوند کا۔

یقیناً اُس کو دفتر میں کافی کام پڑتا ہے۔لیکن اسکو گھر کا اور گھر کے افراد کا بھی دباؤ رہتا ہے۔اس چیز کو عمرانیت میں Role conflict کہتے ہے۔ یہ وہی احساس ہے جس سے عورت ذہنی الجھنوں کا شکار

ہورہی ہے۔ وہ اسلیئے کہ ہم نے عورت کے باہری کام کاج کوشاید مادیت کے دباؤ میں قبول تو کیا ہے لیکن گھر کے اندرونی کام کاج میں اُس کو کوئی راحت نہیں دی۔ آجکل عورت کو اتنی نفسیاتی بیماریوں کی الجھن ہے جس سے وہ اعصابی بیماریوں کی بھی شکار ہوگئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سماج میں زچہ اور بچہ دونوں کے ہزاروں مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور ایک فساد سا برپا ہو گیا ہے۔

۴۔اپریل۔۲۰۲۰

میں نے کئی بار اِس چیز کو دل کی گہرائی سے محسوس کیا ہے کہ کام یا کسی عہدے پہ پہنچنا کوئی بڑی کامیابی نہیں۔انسان کو زندگی کے ہر میدان میں مربوط طریقے سے مطمئن رہنا چاہیئے۔کچھ انسان کسی ایک عہدے پر فائز ہو کر پوری عمر یا تو اُس عہدے کو پہلے حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں یا تو کوئی عہدہ حاصل کر کے زندگی بھر اُس عہدے کو سنبھالنے میں لگتے ہیں اور باقی بہت چیزوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔انسان کو مربوط چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر اُن سب چیزوں کو حاصل کر کے وہ اپنی صحت اور اخلاقیات کو گنوا بیٹھے تو یہ ایک المیہ سے کم نہیں ہے۔بھلے ہی وہ اپنے کیرئر میں کامیاب دکھائی دے رہا ہو۔

اسی طرح کچھ عورتوں کے پاس نوکری job تو ہے لیکن مربوط ساخت Holistic Development نہیں ہے یعنی کام کے دباؤ سے

وہ ذہنی تناؤ میں مبتلا ہے اور اکثر اس کے چلتے وہ بانجھ پن کی شکار رہتی ہے۔ یہ ایک ایسا لمحہ فکریہ ہے جس پہ سوچنا اشد ضروری ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم مادیت کی دوڑ میں وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں سے ہم لوٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔اس ساری صورتحال میں اگر کوئی پس رہی ہے تو وہ ایک عورت ہی ہے۔

۸۔اپریل۔۲۰۲۰

آج میری ماں کا انتقال ہوا جو میرے لئے ایک بہت بڑے صدمے سے کم نہیں ہے۔اس کمی کو لکھنے میں اگر سمندر کا پورا پانی بھی سیاہی بنا کر استعمال کیا جائے تو کم پڑے گا۔میری ماں شہرِ خاص کی رہنے والی تھی جو اپنے صفات میں گاؤں کی ان عورتوں کو پیچھے چھوڑ سکتی تھی جو گھر میں کافی جگہ اور کافی افرادی قوت کے باوجود گائے اور مرغے پالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔میری ماں نے جب ہمارے دیہاتی گھر میں قدم رکھا وہ بھی اس زمانے کی کم عمری میں تو اسکے سر پہ پہاڑ جیسی ذمہ داریاں آن پڑیں۔وہ شالی کی فصل کو بونا شاید کہانیوں میں سنتے آئی تھی مگر یہاں اسنے وہ کر کے دکھایا۔اس کے گھر میں نل سے پانی آتا تھا اور یہاں اسے برفیلی کالی راتوں میں ندی نالوں کا رخ کرنا پڑا۔مجھے وہ دن یاد ہے جب میرے والد کے ایک دوست نے میری ماں کے ہاتھ کی مکئی

روٹیاں کھا کر میرے والد صاحب سے یہ پوچھا کہ اُس نے یہ روٹیاں کہاں سے منگوائی ہے جو شاید کوئی پہاڑی عورت بھی نہیں بنا سکتی تھی ۔ جب اس نے میری ماں کا نام سنا تو وہ حیران ہوگیا۔ ہمارے گھر میں مجھے یاد ہے مرغوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ کچھ لوگوں کو پتہ تھا کہ شاید ہم نے پولٹری فارم لگایا ہے ۔ میری ماں سرسوں کے پھولوں سے لیکر گاؤں کی ہر اس چیز کا مزہ لینا چاہتی تھی جو اس نے سسرال میں تصور کیا تھا۔

جب کبھی تنہائی میں اکثر اپنی ماں سے یہ پوچھ لیا کرتا تھا کہ اس کو کس چیز نے گاؤں میں شادی کرنے میں آمادہ کیا تھا اگرچہ یہ تقدیر کا کھیل ہے تو اس کا جواب سن کر مجھے ہسی آ جاتی تھی۔ وہ جواب تھا کہ بیٹا مجھے گاؤں کے سرسوں کے پھولوں سے کافی محبت تھی ۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ گلاب کا دوسرا رنگ ہے لیکن کسے خبر تھی کہ اس میں تمہارے والد صاحب کے کانٹے چھپے ہوئے ہیں۔

۱۹۔اپریل۔۲۰۲۰

اس صدی کی سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ ہم نے سماج اور تہذیب پہ توجہ نہ دی حالانکہ ہم نے علمِ بشریات Anthropology میں جتنی تحقیقات کی وہ یا تو قبائلی زندگی کے بھینٹ چڑھ گئی یا ان حساس زاویوں کو برسرِ پیکر لانے میں صرف ہوئی جو اکثریت سے بہت دور تھے۔شہری آبادیوں کے مختلف نفسیاتی زاویوں کو سمجھنے میں ہم قاصر رہے اور نا ہی اس پر کوئی کام ہوا ہے جبکہ شہری سماجی ساخت Urban social structure براہِ راست دیگر قصبہ جات کی سماج کو بنانے میں حائل اور مائل ہے۔شادی بیاہ ، گھر کے رسم و رواج ، میاں بیوی کے خیالات میں تفاوت پر ہی ہماری ذہنی ساخت پروان چڑھتی ہے۔ان سب چیزوں کا براہِ راست ایک گھر پر اثر تو پڑتا ہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ باقی سماج کو بنانے میں کارفرما ہوتا ہے۔مثلاً

۱۔ ایک انسان کی زندگی میں بچپن سے کون سے عوامل شامل رہے۔

۲۔ سوشل انڈکیٹرس social indicators ، سوشل کیپ ٹل Social capital کے علاوہ وہ گھر میں کس طرح کے ماحول میں رہا ہے یا اُس کی پرورش میں کونسے عوامل شامل رہے۔

۳۔ اُس کے تفریح recreation اور outing پر اُن کا ماحول اور ردِعمل کیا ہے۔

۴۔ اپنے ساتھیوں peer group میں بچے کو کتنا تسلیم کیا گیا ہو۔

۵۔ دنیا میں انسان کے ساتھ رونما ہوئی کچھ اور چیزیں جو اسکی سوچ کو بناتی ،سنوارتی یا بگاڑ دیتی ہیں۔

٦ اسکی سوچ پہ موروثی عوامل کتنے شامل ہیں۔

۲۷۔اپریل۔۲۰۲۰

شازیہ بات کرنے کے انداز اور تحقیق کے اعتبار سے بہت اچھی لڑکی تھی۔لیکن مجھے صائمہ کی طرح اسکا دکھڑا بہت طویل لگا۔دراصل سچ بھی یہی ہے کہ جب کسی عورت پر گھریلو تشدد کے واقعات گزرتے ہے یا تو وہ بہت حساس ہو جاتی ہے یا سماج اسے پاگل قرار دیتا ہے۔ کیونکہ ہمارے سماج میں عورتوں کے عوض خدمات تو ہیں لیکن منظّم organised طور سے عورت کی بہبودی کے لئے کوئی مرکز نہیں۔مرکزی سرکار نے عورت کے لئے اسکی عزتِ نفس برقرار رکھنے کے لئے کتنے ہی پروگرام بنائے۔وہ چاہے women one stop centre ہو یا سودار گرح soudargrah، عورت کے لئے اور زیادہ چنوتیاں پیدا ہوئیں۔یہاں پر مجھے علامہ کا وہ شعر یاد آتا ہے کہ "ہزار بار حکیموں نے اِس کو سلجھایا

مگر یہ مسئلہ زن رہا وہی کا وہی "

نفسیاتی تشدد اور ذہنی تشدد جیسی بھیانک چیزوں نے عورت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی ہے اور دن بدن نفسیاتی مسلوں میں اُلجھتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ اسلئے کیونکہ ہر ایک لڑکی کا خواب ہوتا ہے کہ اسے ایک من پسند جیون ساتھی ملے جو اسے ہمیشہ پیار اور عزت سے نوازے۔ اور جب وہ اسی ایک انسان میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا دکھ دیکھتی ہے تو اس کی زندگی کی ساری امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں اور وہ ایک زندہ لاش بن کر زندگی گزارتی ہے۔

۱۳۔ مئی۔۲۰۲۰

عورت کے بنیادی حق کی پاسداری بہت ضروری ہے لیکن امپاورمنٹ empowerment کے نام پر social engineering یا social entrepreneur کو لے کر عورت کی اقتصادی حالت کو مستحکم بنانے کی جو باتیں ہوتی ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ ریاستوں میں زور پکڑتی ہوں۔لیکن ان شہروں یا ریاستوں میں جہاں مسلم اکثریت ہے یا جہاں غریبی کی سطح موٹی نہ ہو یہ چیزیں قابل عمل نہیں ہیں۔

ہاں ایک بات اور ہے۔ کچھ عورتوں کو اسلام کی اصلی روح سے بیگانہ کیا گیا ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ عورت کی پست حالی مذہب کی وجہ سے ہے یہ بالکل غلط بات ہے۔عورت کی امپاورمنٹ کی ابتدا اُس کے گھر سے ہوتی ہے۔

اگر ہم ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ کالج میں ایک لڑکی کو تفریح outing کرنے دینا چاہیے لیکن دوسری طرف لڑکی کے ساتھ جنسی تشدد کے ڈر سے اُس کو دن میں دس فون کرتے ہیں تو اسکا مطلب

قطعی یہ نہیں کہ معاملہ عورت کے ساتھ ہے یا وہ لڑکے سے کم ہے معاملہ براہ راست معاشرے سے ہے۔ معاشرے میں بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جو آج تک قانون حل نہیں کر پایا لیکن سماج اس میں کافی حد تک سدھارنے میں مدد کرسکتا ہے۔ اُس میں :

۱۔ لڑکے کی پرورش

۲۔ لڑکے کو لڑکی کے ساتھ پیش کرنے کا بہترین ماڈل دینا۔

۳۔ مذہب کو صحیح معنوں میں پیش کرنے کی ضرورت۔

۴۔ سماجی کنٹرول یا social control وغیرہ وغیرہ۔

مذہب اسلام دنیا کا ایک ایسا واحد مذہب ہے جو عورت کے بنیادی حقوق ادا کرنے میں پیش پیش ہے۔ یہ بات بھی غور کرنے لائق ہے کہ حضور اکرمؐ کا آخری خطبہ بھی عورت کے حقوق پر مبنی تھا۔

۱۔ بیٹی کو ایک تہائی حصہ۔

۲۔ جسکو بیٹی اسکو جنت۔

۳۔ بیٹی اور بیٹے کے ساتھ یکساں برتاؤ۔

۴۔ مہر مرد کو دینا نہ کہ عورت کو۔

۵۔ طلاق اگر مرد دے تو ہرجانہ۔

۶۔ ایک سے زیادہ بیوی ہونے پر انکے کے ساتھ یکساں سلوک۔

۷۔ بیٹی اور داماد کی عزت۔

۸۔ بیٹی ایک بہترین ساتھی۔

عورت کی امپاورمنٹ میں سب سے زیادہ موثر طریقہ مردوں کو زیادہ سبق دینا یا عورتوں کو نکاح کے حصول کے بارے میں آگاہ کرانا ہے نہ کہ صرف مہر کے بارے میں بتانا۔ ایک مرد ہی ایک عورت کی وقار کا نگہبان ہے۔

آج کل رشتہ کرنا بھی ایک پہاڑ جیسا کام ہے۔ ہماری وادی کشمیر میں اَن پڑھ لڑکیوں کی تعداد شاید دو لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی ہیں۔ اسکی بہت سارے وجوہات ہیں۔

۱۔ لڑکیوں کے والدین میں بے بھروسی (Trustlessness)۔

۲۔ نامسائِد حالات سے لڑکیوں کی شرح اموات میں اضافہ۔

۳۔ ہمارے یہاں نجی (pvt.) شعبے میں روزگار کے مواقع نا ہونے کے برابر۔

۴۔ جہیز اور دوسرے رسوماتِ بد کی بڑھتی ہوئی بہتات جہاں لڑکیوں کے والدین بے بس نظر آتے ہیں۔

۵۔ یا یوں کہا جائے کہ ہمارا سماجی ڈھانچہ کافی حد تک تو ٹوٹ گیا ہے جہاں لوگوں کی من مانیاں بڑھ گئی ہیں یا تو ڈھانچہ ڈگمگا رہا ہے جہاں لوگ بلا سوچ و سمجھ اور بے یار و مددگار ہیں۔

غرض شادی میں دیر یعنی late marriages نے ہمارے سماج میں بہت ساری خرابیاں پیدا کی ہے۔ جس میں بے چینی ، اخلاقی گراوٹ ، اور بعد میں بانجھ پن کی وبائی صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔

۲۹۔مئی۔۲۰۲۰

عورت کی نوکری اور اُس کا آفس میں جانا ہمارے یہاں چار پانچ دہائیوں سے پرانا نہیں اور دوسری طرف ہماری مخلوط تعلیم بھی کچھ زیادہ پرُانی نہیں ہے۔شاید اسی لئے ہمارے سماج میں ابھی بھی عورتوں کے باہر کام کرنے کے سسٹم کو لیکر اگرچہ مادیاتی طور کوئی فساد نہیں ہے لیکن سماجی اور نفسیاتی طور گونا گو مسائل ہیں۔شاید ابھی بھی عورت کی باہری دنیا اور اندورونی صورتحال میں کافی نا متوازن قدروں کو لگاتار پریشانیوں کا سامنا ہے۔

اگرچہ حکومت نے اس ضمن میں بچوں کی پرورش کی leave جسکو سرکاری زبان میں child care leave سمجھا جاتا ہے واگذار کرایا ہے۔ تاہم غیر سرکاری انجمنیں جس میں ہماری دینی، سماجی اور دوسری رضا کار انجمنیں بھی شامل ہے اس ضمن میں ناکام دکھائی دے رہی ہیں۔

اسی لئے میری رائے میں نجی سطح پر کسی بھی قیمت پر اِس institution پر کافی محنت کرنے اور سدھار لانے کی ضرورت ہے۔اور اپنے من سے اس فتور کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۱۔مئی۔۲۰۲۰

ہمارے سماج میں گھریلو خادمہ یعنی Domestic maids کا رواج بھی بڑی تیزی سے زور پکڑ رہا ہے۔ یہ بات تو ٹھیک تھی لیکن آخر کار ایک گھریلو خادمہ بھی ایک عورت ہی ہوتی ہے اور اپنا کام وہ اپنی مرضی سے کمائی جٹانے کے لئے بھی کر سکتی ہے لیکن اکثر اوقات ایسی عورتیں کسی مجبوری کے سبب یا سر چھپانے کی غرض سے کرتی ہیں۔ ایسی عورتوں کے عوض بھی انسان کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اب تو اقتصادی طور پر مضبوط ممالک میں گھریلو خادمہ کے حقوق اگرچہ واضع ہیں تاہم گھریلو خادمہ کے حاملہ ہونے کی بہت ساری قبی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں جو غلطیاں خود گھر کے مالکان سے سرزد ہوتی ہیں۔

گھریلو خادمہ کبھی کم عمر کی بھی ہو سکتی ہے۔ جو عمر اصل میں

اسکے پڑھنے لکھنے کی ہوتی ہے۔ کیا ہم اپنی بچیوں کے لئے یہ سب پسند کر سکتے ہیں۔ ہمارے مذہب اسلام نے گھر کے کام خود کرنے والی عورت کو بہت ذیادہ پسند کیا ہے اور اس کے لئے کئی درجات معین کئے ہیں لیکن اکثر عورتیں کاہلی اور بے غیرتی کا شکار ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے گھریلو خادمہ کو گھروں میں داخلہ تو مل جاتا ہے اور پھر ہم اخلاقی قدروں کو پامال کر کے اُس کو اذیتیں پہنچاتے ہیں۔

ا۔جون۔۲۰۲۰

گھریلو تشدد میں صرف ایک عورت ہی نہیں پستی، ایک مرد بھی کافی پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔اگرچہ وہی اکثر خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس تشدد کے شکار بچے ہیں جو غیر شعوری طور سب سے زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں۔لیکن ایک بات بہت اہم ہے اور وہ ہے کہ اس شر سے سب سے متاثر ہوتے ہیں گھر کے بزرگ جن کی مشکلات کو ہم اکثر ان دیکھا کرتے ہیں۔

کل جب میں پارک میں ٹہلنے کے لئے گیا، وہاں ایک عمر رسیدہ شخص سے میری ملاقات ہوئی۔ بات کرتے کرتے اُس عمر دراز شخص نے اپنے گھر میں چلتے آرہے اُس کی بہو اور بیٹے کے درمیان گھریلو تشدد کے مقدمے کی بات چھیڑ دی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بزرگ کی آنکھوں میں نمی سی تھی جب اس نے اپنا حال دل مجھے سنایا۔اس کا کہنا تھا کہ ان کے گھر میں چار ہی کمرے ہیں

اور وہ بزرگ میاں بیوی جس کمرے میں بیٹھا کرتے تھے وہاں اس عمر رسیدہ آدمی نے اپنی پنشن کی رقم سے ایک اے۔سی نصب کروایا تھا لیکن عدالت کے ایک فیصلے میں وہ کمرہ انکی بہو کو دیا گیا۔انکو خود ایسے کمرے میں دھکیل دیا گیا جہاں پہ بہت سردی رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ بہت بیمار رہتے ہیں۔

۱۱۔ جون۔۲۰۲۰

اگر آپ مسلمان ہے تو آپ اپنے مسائل اسلام کے ہی سپرد کریں پھر اللہ تعالیٰ اپنی برکت اور فضائل سے دو دلوں میں پھر سے صلح ڈال سکتا ہے۔ دلوں کے گوشے بدل سکتے ہیں۔ ذہنوں کو چین مل سکتا ہے۔ اگر آپ مسلمان ہے تو خاوند کے حقوق آپ پر فرض ہیں۔ آپ اس داماد کو گالی نہیں دے سکتے جس کی عزت خود اللہ کے نبیؐ نے کی ہے۔ آپ اپنی بیٹی کو بھی شفقت کی چادر میں لپیٹ سکتے ہیں لیکن اپنے داماد کے سر سے ٹوپی نہیں گرا سکتے۔ اب ایک کڑوی بات یہ بھی ہے جس کو شریعتاً واضح کیا گیا ہے کہ آپ کی بیٹی اپنے خاوند سے پوچھے بغیر آپ کے گھر بھی نہیں آسکتی۔ اگر ان سب چیزوں کو مدِنظر رکھیں تو ہم ایک خوبصورت معاشرے کی تشکیل میں مدد فراہم کر رہے ہیں۔

اللہ کے نبیؐ نے ہر ایک انسان کے حقوق متعین کر دئے ہیں جو

مصلحتاً اور حکمت کے اعتبار سے ہر وقت کے لئے سنہری اصول قرار دیئے گئے ہیں ۔ یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حکومت اور سرکاری اعتبار سے عورتوں کے لئے قوانین بدلتے رہتے ہیں لیکن جو قوانین اللہ اور اس کے رسول ؐ نے مقرر کئے ہیں وہ آفاقی ہیں اور فقط انسان کی بہبودی کیلئے بنائے گئے ہیں جو اس کی دنیاوی اور آخرت کی زندگی سنوارنے کے لئے کام کرتے ہیں، اگر ہم ایمان رکھتے ہیں۔

۲۱۔ جون۔ ۲۰۲۰

آپ کی قدریں نہیں بدلنی چاہیے۔ آج آفس میں ایک شخص آیا اور کہا کہ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کے لئے ایک کشمیری لڑکا ہی کیوں چنا جو بعد میں آوارہ اور نکما ثابت ہوا۔ اب مجھے اس بات پہ پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں کیوں اپنی ثقافت اور تہذیب کے عشق میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی کیونکہ ایک طرف اگر انسان کے جذبات اور خواہشات اس کے اپنے تہذیب کی قدر کرانا سکھاتے ہیں اور اگر لوگ شادی بیاہ کے معاملے میں اپنی تہذیب کے عوض دیوانے ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف ان کو قسمت پہ پچھتاوا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ دو الگ چیزیں ہیں۔

۱۳۔ جولائی۔ ۲۰۲۰

آج کچھ طبعیت ٹھیک نا ہونے کی وجہ سے میں نے سوچا کہ میں گھر پر ہی رہوں۔ ہفتے کے سات دنوں میں کوئی دن انسان کو اچانک ٹھیک لگنے لگتا ہے۔ ایسا ہی ایک دن جمعرات کا دن ہوتا ہے۔آج بہت عرصے کے بعد لگ رہا تھا کہ کچھ قیلولہ سا کیا جائے۔ طبعیت بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

یہی کوئی ساڑھے بارہ کے آس پاس میری ایک کلیگ محترمہ رفیقہ جی نے مجھے فون کیا۔دراصل آفس میں ایک گھریلو تشدد کا ایک اور مقدمہ موصول ہوا تھا جو میرے بغیر پیش رفت نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقدمے کی ایک بہت بڑی بات یہ تھی کہ یہ پہلا ایسا مقدمہ تھا جو گاؤں کی زندگی سے وابستہ تھا۔

میں نے یہ چیز بڑی شدت سے محسوس کی تھی کہ گھریلو تشدد کے زیادہ تر مقدمے پوش علاقوں سے آتے تھیں۔گاؤں کے گھرانوں میں ایک اہم بات یہ دیکھنے کو ملتی ہے کہ وہاں مشترکہ گھرانے joint

Arranged شادیاں families زیادہ ہوتے ہیں اور جن میں طے شدہ شادیاں marriages ہی زیادہ تر کرائی جاتی ہیں جن شادیوں اور گھرانوں میں گھریلو تشدد جیسے واقعات کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ اسلئے کہ گھر کے باقی افراد میاں بیوی کے درمیان صلاح سمجھوتہ کا کام دیتے ہیں اگر چہ خود ہی وہ اس رشتے کو توڑنے کا عزم رکھتے ہیں جیسا کہ کچھ خاندانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے جہاں گھر کے دیگر افراد اکثر میاں بیوی کی خوشیوں کے آڑے آجاتے ہیں اور انکی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔

۱۷۔جولائی۔۲۰۲۰

قدامت پسند سوسائٹی میں رہنے کا ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ وہ لوگ ابھی بھی زمینی سطح سے قریب take off phase میں ہوتے ہیں جو تھوڑے سے اپنے روایتی قدروں میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں یا ان کا دل چاہتا ہے کہ وہ آزاد پنچھی کی طرح اُڑیں۔ اگر یہاں عورت کی نگہبانی کے لئے بہت سارے محکمے کام کر رہے ہیں پھر بھی انسان کے ذہن میں الجھن ہے اور اُن سے نمٹنے میں کافی وقت لگ سکتا ہے اور یہ نہایت اہم بات ہے کہ رات دن میں کوئی بھی قوم کسی غیر متوقع تبدیلی کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ ہماری مادیت بہت آگے بڑھ گئی ہے لیکن ہماری قدریں بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔ پرانی سوسائٹی میں ہر ایک چیز سے نمٹنے کا الگ نصب العین تھا لیکن لوگوں میں پھر بھی انسانی تہذیب کی قدریں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ آج

کل کا معاشرہ بہت حد تک سکیولر secular بن گیا ہے۔ اسلئے یا تو ہمیں پرانا معاشرہ اور اس کا طریق کار زندہ کرنا ہوگا یا ہمیں پھر جدید سماج کے تقاضوں کو زندہ کرنا ہوگا۔ ہم دو کشتیوں میں سوار نہیں ہو سکتے۔ اسطرح سے تو ہمیں ڈوبنے کا ہی خطرہ لاحق رہے گا۔

۲۹۔ جولائی۔ ۲۰۲۰

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ زندگی کے آخری ایام میں بیوی کا اور خاوند کا سہارا کتنا ضروری ہے۔ جب ایک انسان کی عمر ڈھل رہی ہوتی ہے، ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی آرزو شدت پکڑتی ہے انسان ایک دوسرے کو کافی حد تک سمجھ گیا ہوتا ہے اور اولادیں بھی اب شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہوتی ہیں اور دل میں کہیں نہ کہیں اس دنیائے فانی کو چھوڑنے کا ڈر بھی گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ اِس سب میں طلاق کے بارے میں سوچنا ایک المیہ اور قیامت سے کم نہیں ہے۔

آجکل ہمیں کئی ایسی درخواستیں موصول ہو رہی ہے جن میں 65-60 عمر کے ریٹائرڈ لوگ جنہوں نے اپنی زندگی میں کافی نام کمایا ہوتا ہے اور اقتصادی طور پر بھی آسودہ حال ہوتے ہیں طلاق کے بارے میں سوچتے ہیں۔

میں نے اس چیز کے بارے میں بہت سوچا۔ حاصل مقصد یہ ہے کہ وجوہات ہم سب کو پتہ ہیں۔ نہ جانے ہم کیوں ان دیکھا کرتے ہیں ۔ انسان کا ایک دوسرے انسان کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہوگیا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مستقبل ایک ایسے معاشرہ کی اور گامزن ہے جہاں دماغی امراض اونچے پیمانے پر انسانوں کو اوزون ozone کی طرح گھیرے میں لئے ہوئے ہیں جہاں خوشی کے سورج کی کوئی بھی کرن ہمارے وجود کو نہیں چھو سکتی۔ میں کافی پریشان ہوں کہ ہماری ویرانیوں میں خواہ مخواہ بھٹکنے کی حِس کیونکر زور پکڑتی جارہی ہے۔

۳۱۔جولائی۔۲۰۲۰

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو میاں بیوی رشتے میں ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو شدت سے چاہتے ہیں وہ یکا یک کیسے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔گالی گلوچ پر اتر جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے بے ہودہ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ بعد میں یہ باتیں کورٹ کچہری کے ایوانوں تک بھی پہنچ جاتی ہیں اور دو بالغ انسانوں میں جو شائستگی ہونی چاہیئے وہ تو خراب ہو ہی جاتی ہیں۔ساتھ میں خاندان، کنبہ اور سماج بھی ہنسی مذاق کا موجب بن جاتے ہیں۔

ایک اور بات جو بہت اہم ہے جو ہم نے بہت ساری عورتوں سے سنی اور محسوس کی وہ یہ ہے کہ ہمیں تو وہ مل گیا جو ہمیں قانون سے چاہیے تھا لیکن ہم اپنے خاوندوں کو اس کے بغیر بھی چین سے رہنے نہیں دیں گے کہ وہ دوسری شادی کریں۔حالانکہ مردوں میں یہ

بات دیکھنے کونہیں ملتی ۔ ہوسکتا ہے کہ مرد ہمارے سماج میں آزادانہ حیثیت رکھتا ہولیکن ہماری سی ۔ڈی ۔پی ۔او cdpo صاحبہ اکثر اس بات کا تذکرہ کرتی ہیں کہ اس نے حیدرآباد کے ایک میاں بیوی کے بیچ میں ایک طلاق کے بعد کی (post divorce) زندگی دیکھی ہے جہاں میاں اور بیوی اس طرح ایک دوسرے سے الگ ہوئے جیسے دو دوست کسی خاص وقفے کے لئے بچھڑ کر ایک مختصر سفر پہ جارہے ہوں ۔ اسطرح سے عورت خود کونفسیاتی اضطراب سے بچا سکتی ہے اگر وہ مرد کے طلاق کے بعد کی زندگی جو وہ کسی اور عورت سے گزارنا چاہتا ہے، قبول کرلے۔

۱۱۔اگست۔۲۰۲۰

ہمارے پاس ڈھیر ساری ایسی مثالیں موجود ہے جہاں پر سماج میں اس بڑھتی ہوئی بدعت کو جنم دینے میں مرد اور عورت دونوں کا رول ہے لیکن اس سب کے بیچ میں عورت ہی زیادہ پسی جارہی ہے۔ کیونکہ ایمپاورمنٹ Empowerment کے نام پر جو نام نہاد تنظیمیں عورت کی بہبودی اور بقا کے لئے کام کررہی ہیں وہ سماج کی اوپری سطح کو دیکھ رہی ہیں۔اندورونی مسائل کو تو سماج ہی ٹھیک کرسکتا ہے۔

دراصل کچھ برسوں سے جو قوانین جموں کشمیر کو حاصل ہوئے اس نے عورت کو ایک نازک موڑ پہ کھڑا کردیا بلکہ ایک نئے اضطراب میں ڈالا اور ایک نئے سماج کو جنم دینے کی کوشش ہورہی ہے جس میں ایک پرُانا سماجی ڈھانچہ پوری طرح ڈہ جائے کہ ہمیں پرانی قدروں کو پوری طرح بھلانا پڑے۔ہوسکتا ہے کہ عورت اس

ماحول میں خود کو آزاد محسوس کرے۔ لیکن ایک سماجی ماہر ہونے کے ناطے کہنا چاہوں گا کہ ہمارا سماجی ڈھانچہ پہلے سے بھی زیادہ کمزور پڑ جائے گا جسے نامساعد حالات نے پہلے ہی اتنا ڈھیلہ ڈھالہ کر دیا ہے کہ ہماری پرانی سماجی قدریں کمزور کیا بالکل ختم ہونے کے دہانے پر ہیں۔

۳۔مارچ۔۲۰۲۱

شادی ایک ایگریمنٹ ہے جس میں اگرچہ دنیا کی ساری عظمتیں پنہاں ہیں تاہم اگر یہ منقطع ہوجائے تو زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایک انسان کے ساتھ دوسرے انسان کا رشتہ نہ صرف جسمانی بلکہ جذباتی اور روحانی بھی ہوتا ہے۔ ریاست کے باہر والے معاشرے اور سماج میں یہ بات بہت عام ہے کہ طلاق کے بعد بھی دو انسان اس طرح بچھڑتے ہیں کہ دوبارہ ایک دوسرے سے ملے تو عزت واکرام سے ملیں۔ یہ چیز دنیا کے ہر رشتے پر عائد ہوجاتی ہے کہ جس رشتے کو ٹوٹنے کا اندیشہ ہر گھڑی لگا رہتا ہے اس رشتہ کے ٹوٹنے پر انسان الگ رہ کر ڈگمگا سا جاتا ہے۔ میاں بیوی کے بیچ میں ڈھیر ساری تلخیوں کے درمیان کچھ میٹھی یادیں اور پیار بھرے پل ضرور ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہی یادیں کل ان کے درمیان صلح و سمجھوتا کا ذریعہ بنے لیکن اگر انسان بچھڑتے وقت زہر اگلے تو اچھی خاصی یادیں بھی انسان کے ذہن میں زہر گھول سکتی ہیں اور پھر کل بچھڑنے کے بعد ملنا کیا، بچھڑنے کے بعد بھی انسان کبھی سکون سے نہیں رہ سکتا۔

۶۔ مارچ۔ ۲۰۲۱

تاریخ گواہ ہے کہ انسانوں نے ہمیشہ مذہب اور شریعت کو اپنے مفاد کے لئے یا اپنی کمزوریاں اور لغزشیں چھپانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اگرچہ مذہب انسانوں کی رہنمائی کے لئے باعثِ رحمت اور عظمت ہے لیکن انسانوں کی مطلب پرست دنیا میں مذہب کی آڑ میں بہت سارے ایسے کام کئے جاتے ہیں جس سے شیطان بھی شرما جائے اور اس ضمن میں مذہب کا ہتھیار اگر کسی کے لئے بڑی شدت سے استعمال کیا گیا تو وہ عورت ہے۔

ہمارے مشاہدے میں آیا ہے کہ جب مرد کے سب ہتھیار ایک عورت کے خلاف کمزور پڑ جاتے ہیں تو وہ اپنی جہالت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے مذہب کو ایک ہتھیار بنا کر استعمال کرتا ہے۔ ان سب چیزوں سے مرد کو ایک سکہ مل جاتا ہے جس کی مدد سے وہ ایک جواز تو خرید لیتا لیکن اصل میں وہ بڑے گھاٹے میں چلا تو جاتا

ہی ہے مگر اللہ کے غضب کو بھی واجب کر دیتا ہے۔ حالانکہ سماجی اور قانونی طور سے وہ بچ نکل سکتا ہے لیکن وہ ہمیشہ جذباتی طور پر کمزور ہی تصور کیا جاتا ہے اور کہیں نہ کہیں اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہے۔

مذہب انسان کی بھلائی کا ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کی زندگی میں امن اور آشنائی لاتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ مذہب کی مدد سے اور اپنے شیطانی دماغ سے اپنے لئے ہمیشہ کے لئے گمراہی خرید لیتے ہیں۔

۱۳۔ مارچ۔ ۲۰۲۱

آج میری توجہ ایک اہم سماجی بدعت کی طرف گامزن ہوئی جو کہیں نہ کہیں عورتوں سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہماری وادی کشمیر میں کئی دہائیوں سے شادی میں تاخیر کرنے کا رواج زور پکڑ رہا ہے ۔ اسکی بہت ساری وجوہات ہیں جنکی فہرست بہت لمبی ہیں اور یہاں بیان کرنا مناسب نہیں۔

شادی میں تاخیر سے لڑکیوں کی کافی عمر مائکے میں ہی گزر جاتی ہے۔ اکثر شہر سرینگر میں لڑکیوں کی شادی 35 سال سے پہلے تصور نہیں کی جاتی جس کی وجہ سے وہ صحت کے اعتبار سے بہت کمزور ہو جاتی ہیں اور جب بھی بچے پیدا ہوتے ہیں وہ ذہنی اور جسمانی ساخت سے بہت کمزور پیدا ہوتے ہیں۔

اکثر ایسی لڑکیوں کو بچے بھی پیدا نہیں ہوتے جو آخرکار طلاق کا موجب بھی بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مشکلات کا سامنا

بھی ایک لڑکی کو کرنا پڑتا ہے جیسے کہ اسقاط حمل وغیرہ۔

ماہر امراض کا کہنا ہے کہ دیر عمر میں لڑکیوں کی بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کافی حد تک متاثر ہوتی ہے اور بچے بھی جسمانی طور ناخیز پیدا ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ دوسری طرف سماجی ماہر اس عمل سے سماجی خرابیاں پیدا ہونے کے خطرات سے آگاہ کرتے ہیں جیسے کہ جنسی بے راہ روی وغیرہ۔ اسلئے لڑکیوں کی شادی ایک مقررہ وقت پر ہی ہونی چاہیئے۔

۱۹۔ مارچ۔ ۲۰۲۱

شاید اس سے پہلے ہماری نظران مقدمات پر نہیں پڑی ہوگی یا تو پہلے یہ مقدمات ہمارے ڈپارٹمنٹ کو نہیں دیئے گئے تھے۔ کیونکہ 2019ء سے جو بہتات گھریلو تشدد کے ہمارے ڈپارٹمنٹ کو موصول ہو رہے ہیں وہ ایک سیلاب کی مانند ہیں۔

اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ 2019ء سے پہلے گھریلو تشدد کا جو ایکٹ 2005ء میں پاس کیا گیا تھا ہماری ریاست میں ابھی نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ اب جب اس کو ہمارے خطے میں جگہ ملی لوگ اسکو کافی زیادہ اپنی زندگی میں عملانا چاہتے ہیں۔ دوسری جانب لڑکیوں کو خود مختاری اور جدید تعلیم نے انہیں اپنے معاملات میں خود مختار بنا دیا ہے جواب ہر زاویئے سے اپنے رشتے کو دیکھنے لگے ہیں۔

اس سے پہلے شاید یہ معاملات بلا اطلاع unreported بھی

ہو سکتے ہیں ۔ کیونکہ مجھے پوری طرح یاد ہے ایک بار میں بڈگام کی عدالت میں ایک حلف نامہ affidaivit لکھانے کے لئے گیا۔ جہاں صرف چند منٹوں میں ہی میں نے کافی زیادہ ایسے کیس دیکھے جو لڑکیوں کے بھائی یا انکے والد حضرات لکھانے کے لئے آئے تھے۔

جب میں نے ایک حضرت سے پوچھا کہ وہ یہ درخواست کیوں لکھ رہا ہے تو اس کا جواب تھا کہ اسنے اپنی بیٹی کی شادی ایک لڑکے سے کرائی تھی اور جب اسکی بیٹی نے ایک بچہ کو جنم دیا تو رواج کے مطابق اس کو مائکے میں رہنا پڑا تب سے اس شخص نے نہ بیوی کی خیر خبر پوچھی نا ہی اپنے بچے کی اور کہیں دور بھاگ گیا۔

۴۔اپریل۔۲۰۲۱

جب بھی ہم نے کسی عورت سے اُس کے خاوند کے خدوخال کے بارے میں پوچھا تو کسی قابل ستائش بات کے برعکس انہوں نے اپنے خاوند کی صرف مخالفت کی۔سوائے کچھ ایسی عورتوں کے جنہوں نے اپنے خاوند کی تعریف کے پل باندھے۔حالانکہ اس چیز میں کوئی حرج نہیں کہ عورت اپنے خاوند کی نکتہ چینی کرے جس سے ہمیں عورت کے خاوند کے خلاف کیس بنانے میں مدد ملے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت اپنے خاوند کی برائی بیان کرے۔

ہمارے تجربے میں یہ بھی آیا ہے کہ جب ہم نے عورت سے یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ مرد کی کس عادت سے زیادہ پریشان ہے تو اس نے بڑھ چڑھ کر یہ بولنے سے بھی گریز نہیں کہ وہ شراب نوشی کرتا ہے۔حالانکہ برصغیر میں ساٹھ فیصد سے بھی زیادہ لوگ اس لت میں ملوث ہے۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عورت کیس درج کرنے کے وقت مرد کو تہذیبی طور پر اتنا نیچے گراتی ہے کہ وہ دکھانا

چاہتی ہے کہ اسکا خاوند دنیا کا سب سے گرا ہوا انسان ہے۔ اگرچہ یہ قانونی طور کسی ٹھوس چیز کو آشکارا نہیں کرتا تاہم یہ عورت اور مرد کے درمیان پھر سے ملاپ کی ساری سرحدیں ختم کرتا ہے اور خود عورت کی نفسیات کو اور زیادہ زخمی کرتا ہے۔

اسی طرح جب ایک مرد سے پوچھا جاتا ہے تو وہ صرف آخر میں یہی کہتا ہے کہ اسکی بیوی کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس طرح سے وہ لوگوں کی ہمدردی کو ایک نئے طریقہ سے حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری طرف وہ عورت کو اپنے غصہ کا نشانہ بنا کر ہمیشہ کے لئے اُس سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ حالانکہ اس چیز میں سچائی اکثر کوسوں دور دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے پاس بہت ساری ایسی مثالیں موجود ہے جہاں پر تاریخی طور پر ایک مرد نے عورت کو اگر کمزور بنایا تو صرف اسکو بے عزت کر کے ہی۔ حالانکہ جب بھی دو مردوں کے بیچ میں لڑائی یا کوئی بڑا فتنہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ گالی گلوچ کی نوبت آتی ہے، تب عورت کو ہی گالیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس چیز سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ عورت اب بھی حصولِ عزت کے معاملے میں کتنی کمزور ہے۔

۱۸۔مئی۔۲۰۲۱

عورت کی آزادی کے نام پر اب ہم نے عورت پر اقتصادی اور سماجی طور پر بہت دباؤ ڈالا ہے۔اب ہم چاہتے ہے کہ عورت ہی کمائے ،عورت ہی بچوں کی پرورش کرے اور عورت ہی گھر کے کام کاج سنبھالے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرد پھر کیا کرے۔کیا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے عورت کی تباہی کا تماشہ دیکھے یا خود بھی سماجی ذمہ داریوں کو نبھائے۔

برسوں پہلے ایک ایسی عورت سے بات ہوئی جس کے شوہر نے 2014ء کے تباہ کن سیلاب میں اپنی سیلز مین sales man کی نوکری گنوادی۔کیونکہ وہ دکان جو اسکے مالک کی تھی سیلاب میں بہہ گئی اور دکان کے مالک نے دور کہیں وِدیش میں اپنی زندگی کی نئی شروعات

کرنے کی ٹھان لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد رمضان نامی اس شخص نے دوسری نوکری ڈھونڈنے کے بجائے گھر میں ہی گوشہ نشینی کر لی اور سگریٹ پہ سگریٹ سلگاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ کئی ساری نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا۔ اب بچوں اور بوڑھے ساس سسر کی پوری ذمہ داری میمونہ پہ پڑی جس کی تنخواہ فقط پانچ ہزار روپے مہینہ تھی جو کئی ماہ کے بعد اسکو ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کے سسر نے میمونہ کی زندگی اجیرن بنا دی کیونکہ وہ اپنی بہو کی کمائی کا عادی بن گیا اور جب اسکو وقت پہ تنخواہ ہاتھ میں نہیں ملتی تھی تو وہ اپنی بہو کو مارنے لگتا۔ بچوں کو بھی سکول سے ہاتھ دھونا پڑا اور میمونہ خود نفسیاتی بیماری، ڈپریشن کا شکار ہو گئی۔

۶۔ جون۔ ۲۰۲۱

ایک بار مجھے جموں جانے کا موقعہ ملا جہاں مجھے شکم مادر میں ماری جانے والی بچیوں پر ایک مقالہ پڑھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ وہاں اس بات پر کافی بحث مباحثہ ہوا کہ آخر لڑکیوں کی جنسی شرح کیونکر کم ہوتی جارہی ہے۔ ہماری ریاست جموں وکشمیر میں یہ شرح ۹۸۸ کے آس پاس تھی جبکہ کچھ اضلاع جیسے بڈگام اور اُدھم پور میں یہ شرح صرف ۹۸۸ کے آس پاس تھی۔ حالانکہ سرکار نے اس ضمن میں کافی سارے اقدامات اٹھائے اور غیر سرکاری طور پر بلا جواز ان سب لوگوں کا قلع قمع کیا جو غیر قانونی طور یہ مراکز چلارہے تھے اور لوگوں سے منہ مانگی رقم بٹور تے تھے۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب سینکڑوں کی تعداد میں جنسی جانچ کرنے والے ایسے اداروں کو بند کیا گیا۔ ایک ادارے کے چلانے والے چیرمین صاحب نے یہاں تک بتایا کہ اس نے خود اپنے

ہاتھوں سے نہ جانے کتنی بچیوں کو پیدا ہوتے ہی دریائے جہلم میں پھینک کر درندگی کا مظاہرہ کر کے انسانیت کو شرمسار کیا ہے۔

اب جب اللہ نے مجھے سماجی بہبود میں کام کرنے کا موقعہ دیا تو ایک دفعہ میرے ایک آفیسر نے کہا کہ میں نے اپنی ماں کو ایک سال میں کتنا پیسہ دیا تھا۔ بہت سوچ وچار کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ گورنمنٹ نے میری ماں کو 12 ہزار روپے دیے تھے کیونکہ وہ ایک بیوہ تھی جبکہ میں نے پانچ ہزار سے زیادہ نہیں دئے تھے۔ اسکا مطلب شاید یہ بھی ہے کی حکومت عورتوں خاص کر بیوہ عورتوں کے لئے اقدام تو اُٹھاتی ہے لیکن ہماری آبادی کچھ اتنی زیادہ ہے کہ مالی معاونت کرنے کے بعد بھی کثیر تعداد عورتیں رہ جاتی ہیں۔

۱۸۔جون۔۲۰۲۱

بہت ساری انوکھی باتیں ہیں جو مجھے اکثر یاد آتی ہیں جیسے کہ :

۱۔ آرہ لون کے خاوند کا بیوی بچوں کو چھوڑ کر اپنے دوست کے ساتھ رہنا ، وہ بھی عمر کے آخری حصہ میں۔

۲۔تبسم کا اپنے خاوند کو سب کچھ واپس دینا لیکن نفسیاتی طور پورے وجود میں زہر گھولے رکھنا۔

۳۔ ارم اقبال کا اپنے 'مضبوط' سفارشی خاوند کے خلاف ایک کمزور عورت ہو کر کیس لڑنا۔

۴۔ عشرت عزیز کا الگ رہنا لیکن شادی والا بیڈروم حصہ میں مانگنا۔

۵۔ گھریلو تشدد کے ایک مقدمے کے دوران ایک 15 سالہ بیٹے کی اپنے والد کی سب افسران اور خاندان والوں کے سامنے پٹائی کرنا۔

۶۔ مُسکان نقشبندی کے خاوند کا اپنی پہلی پاکستانی بیوی کے ویزے پر آسٹریلیا میں رہنا اور مہک کو پتہ ہونا کہ اسکی پہلے سے بیوی ہے۔ پھر بھی خاوند کا ویزا بھیجنے کا انتظار کرنا۔

۷۔ چار بیٹیوں کا باپ جولڑکے کے لئے ترستا تھا۔ جب اسکی بیٹی کو بیٹا پیدا ہوا تو اس نے اپنی بیٹی کا طلاق کروایا اور جائیداد میں بیٹا مانگا۔

۸۔ ماسٹر جی کی بیوی کا اسلئے طلاق مانگنا کیونکہ ماسٹر جی دکھنے میں سیدھے سادھے نظر آتے تھے۔

۹۔ فاطمہ منظور کے مقدمے میں وکیل نے خواہ مخواہ پروٹکشن آفیسر کو تنگ کرنے کے لئے اخبار میں جھوٹی خبر بنائی۔

۱۰۔ وکیل لوگوں سے جب بھی بات ہوئی انکی انا بیچ میں آڑے آگئی۔

۱۱۔جولائی۔۲۰۲۱

اسلام میں عورت کے لئے بہت ساری مثالیں موجود ہیں جو عورت کی برتری کو ظاہر کرتی ہے مثلاً:

۱۔ حضور اکرم ﷺ کے آخری خطبہ میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں مسلمانوں کو کافی زور دے کر آگاہ کردینا۔

۲۔ حضور اکرم ﷺ کا تشریف لاتے وقت حضرت صوفیہ جو ایک غلام عورت تھی کی چھاتی سے دودھ پینا۔

۳۔ حضور اکرم ﷺ کا اپنی رضاعی ماں بی بی حلیمہ کے لئے اپنی چادر بچھانا جس چادر کی تعریف قرآن کریم میں کی گئی ہے۔

۴۔ حضور اکرم ﷺ کا خانہ کعبہ کے طواف سے پہلے اپنی بیوی کی اجازت حاصل کرنا۔

۵۔ اسلام میں لڑکی کو باپ کی وراثت میں حصہ دینے کا حکم۔

۶۔ایک لڑکی کا جہیز دینے کے بجائے ایک مرد کا عورت کو نکاح میں

مہر ادا کرنا۔

۷۔ لڑکیوں کی پرورش کو جنت حاصل کرنے کا حصول بنانا۔

۸۔ لڑکیوں کو علم حاصل کرنے کا حکم صادر فرمانا۔

۹۔ مرد کو ایک عورت کا نگہبان قرار دینا۔

۱۰۔ آدم کو جنت سے نکالنے میں عورت کا ہاتھ ہونے کے اہل کتاب کے دعوے کو یکسر مسترد کر دینا۔

۲۶۔جولائی۔۲۰۲۱

میرج کونسلنگ کا نظام اب بڑے بڑے شہروں میں کافی زور پکڑنے لگا ہے۔اب یہ گھریلو تشدد کے معاملے میں کتنا موثر ہے یہ ایک الگ موضوع ہے جس میں کافی تحقیق کی ضرورت ہے۔ فی الحال یہ ایک ایسا تصور ہے جو دو انسانوں میں کوئی نہ کوئی امید پیدا کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہا ہے۔جس طرح شادی سے پہلے دو گھروں اور دو انسانوں کے بیچ میں ایک ثالث mediator کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انھی دو انسانوں یا گھروں میں جب بھی کوئی ان بن پیدا ہوتی ہیں تو ایک کونسلر کی ضرورت پڑتی ہے۔ پرانے وقت میں یہ کام خاندان میں موجود باقی افراد کرتے تھے لیکن آجکل چونکہ غیر مشترکہ nuclear خاندانی تصور ہے۔اسلئے یہ کام ایک کونسلر کو کرنا پڑتا ہے۔کونسلنگ کے

ردعمل کو کامیاب سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے گھاؤ کتنے گہرے ہیں۔

جب کچھ ایسے واقعات یا حادثات رونما ہوئے ہوں جنکی بھرپائی کرنا بہت مشکل کیا ناممکن دکھائی دیتا ہو۔تو اس معاملے میں ایک کونسلر طلاق کی ہی کونسلنگ یا وکالت کرسکتا ہے۔آجکل کے زمانے میں طلاق کو اتنا کلنک stigma نہیں مانا جاتا اور کونسلنگ میں کونسلر ایک عورت کے طلاق کے بعد کی زندگی کے لئے کونسلنگ کرتا ہے۔

۴۔اگست۔۲۰۲۱

کبھی ہمارے پاس ایسا بھی کیس آیا تھا جہاں ایک عورت نے اپنی پوزیشن کا بھرپور استعمال کر کے ایک مرد کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ہم نے یہ محسوس کیا کہ کچھ مرد اور عموماً عورتیں ایسی ہیں جو گھریلو تشدد کے ایکٹ کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔

ایسا ہی ایک کیس نصیر نبی کا ہے۔ جہاں پر نصیر ایک صحافی ہے وہاں شگفتہ ایک اچھے اور آسودہ گھر کی لڑکی ہے اور جو خود بھی ایک سائنٹفک آفیسر ہے لیکن طبعیت کے اعتبار سے نصیر کے مقابلے کافی تیز مزاج ہے۔ جھگڑا اس بات سے ظاہر ہوا کہ نصیر اپنی بیمار ماں کی جانب زیادہ راغب تھا جبکہ شگفتہ کو یہ گوارا نہیں تھا۔ حالانکہ یہ ایسی صورتحال تھی جہاں پر صبر اور تحمل کی زیادہ ضرورت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شگفتہ ہی نصیر کو تنگ کرنے لگی اور حالات دونوں کے طلاق جیسے جائز مگر تلخ حقیقت تک پہنچے۔ اگرچہ نصیر ایک طرف خاموشی سے کام

لینے لگا دوسری جانب شگفتہ نے ایک امیرزادی ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چونکہ نصیر کی ساس بھی ایک اچھے عہدے پر فائز تھی تو ظاہر سی بات ہے کہ اسنے بھی اپنی ہی بیٹی کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ وہ اس جھگڑے کو استعمال کر کے نصیر کے کیریئر کو بھی ختم کرنا چاہتی تھی۔ اس سب سے نصیر کے ذہن وصحت پر کافی منفی اثر پڑنے لگا۔

حالانکہ شگفتہ اور اس کی ماں نے ہم سے بہت جتن کیئے کہ ہم نصیر کے آفس تک یہ خبر پہنچانے کی کوشش کریں مگر ہم نے کان نہیں دھرا۔

نہ جانے کیوں عورتیں ایک مرد سے الگ ہو کے ایک مرد کو صرف تباہ وبرباد دیکھنا چاہتی ہیں۔

۱۱۔ اگست۔ ۲۰۲۱

ایک مقدمے کے سلسلے میں جب ہم ایک گھر گئے تو مقدمے کی تصدیق ایک بڑے خاندان میں کرنی تھی۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سن بلوغیت میں ایک بیٹے نے اپنی ماں کی اذیت کو مدِ نظر رکھ کر اپنے باپ کی پٹائی کردی اور وہ بھی گورنمنٹ ملازموں اور اپنے خاندان کے باقی ممبران کے سامنے۔

یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد کیس تھا۔ اصل میں ادھیڑ عمر کے ایک شخص نے یہ ٹھانی تھی کہ وہ دوسری شادی کرے گا۔ بیوی اسکی سیدھی سادھی تھی۔ بیٹا بڑا سمجھدار تھا اور IAS کی تیاری کر رہا تھا۔ لیکن ماں کے دکھ میں اتنا جذباتی ہوگیا کہ باپ کی سب کے سامنے پٹائی کردی۔

حالانکہ اُسکی اس حرکت سے اسکی ماں کے رشتہ داروں کو کچھ راحت تو ملی ہوگی لیکن ہم نے اس چیز کا سنجیدہ نوٹس لیا کیونکہ کوئی

بھی شخص قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا چاہے کوئی کتنا بھی جذباتی کیوں نہ ہو۔ یہ بات ہر ایک رشتہ دار کو مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ کبھی کبھی میاں بیوی کے بیچ میں چھوٹی سی چیز کو دوسرے افراد اپنی نادانی سے ہوا دے کر آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکاتے ہیں۔

اس مقدمے میں ثالثی کے عمل mediation کے اعتبار سے ہم نے جب پہل کی تو بہت خوشی محسوس ہوئی کہ خاندان کے باقی افراد نے میاں بیوی کے بیچ میں کافی الجھنوں کو گھر میں ہی سلجھایا اور یہ ہوتی ہے طاقت ایک ایسے خاندان کی جہاں گھر میں سارے افراد یکجہتی کے ساتھ رہتے ہو۔

۱۶۔اگست۔۲۰۲۱

ہر ایک لڑکی سے روز قیامت پوچھا جائے گا کہ وہ کیوں قتل کی گئی اور میرے خیال سے قتل دو قسم کے ہیں ۔ایک تو وہ ہے جس میں ایک انسان کی جان لی جاتی ہے اسکو مار کر ۔اور دوسرا قتل وہ ہے جس میں پیدائش سے لیکر مرتے دم تک انسان کو اذیتیں دیکر جذباتی اور نفسیاتی طور مارا جائے اور وہ بھی ایک بار نہیں بلکہ ایک دن میں کئی بار ۔یہ ایک ایسا عذاب ہے جو ہر عذاب سے بالا اور اعلیٰ ہے ۔ کچھ ایسی ہی تشدد اور مار پیٹ کی شکار ہو رہی ہے ہماری عورتوں کی نسل ،جو جیتے جی ذہنی اور سماجی اضطراب سے دو چار ہے ۔

ہاں ہم نے عورتوں کو شانہ بہ شانہ چلانے کی ٹھان لی ہے ۔ عورتیں ہر ایک میدان میں اپنے کام کا جھنڈا اُٹھائے ہوئے ہیں لیکن وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی ہیں ۔ وہ نہ اپنی زندگی کو اپنے معیار کے مطابق جی رہی ہیں اور نا ہی کام کے میدان میں خود مختار

ہیں۔ اگرچہ اپنے دفتر میں کوئی خاتون ایک درجن لوگوں کی آفیسر ہے لیکن گھر میں وہ نا اہل اور بدکردار لوگوں کی لونڈی بن کر زندگی گزار رہی ہے۔

اور شاید ہم یہ بھول رہے ہیں کہ ہمیں قیامت کے دن اس قتل کا بھی ضرور جواب دینا ہوگا۔ لڑکی کو شکم مادر میں مارنا ایک جان کو مارنا ہے لیکن عورت کو جیتے جی مارنا پوری انسانیت کا قتل ہے۔

۹۔ستمبر۔۲۰۲۱

کشمیر میں گھریلو تشدد کون سے طریقے میں موجود ہیں۔ یہ ایک اہم تحقیقی سوال ہے۔اِس چیز کا ذکر میں نے اپنی کتاب گھریلو تشدد۔سماجی وقانونی نظریئے (Domestic violence- Socio-legal e Perspectiv) میں کیا ہے۔لیکن یہاں پہ یہ بات کرنا اشد ضروری ہے کہ اصل میں کس قسم کے تشدد ہمیں دیکھنے کو مل رہے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو یہاں پر زیادہ تر جائداد کے معاملات دیکھنے کو ملتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس خطے میں زبانی اور جذباتی تشدد کم ہے لیکن جائداد کو ہڑپنے، پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری بیوی لانے کی دھمکی دینا اور ہاں جذباتی طور ایک عورت کو کسی حد تک بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔جب وہ جیتے جی اپنے خاوند اور اپنے گھر میں کسی دوسری عورت کو دیکھتی ہے اور وہ بھی جب اسے یہ کہا جائے کہ یہ آپکی سوتن ہے۔

سماجی لحاظ سے ہمیں اس چیز کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ عورت کے

ساتھ کافی تشدد ہو رہا ہے۔ یہ ایک تحقیقی معاملہ ہے لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ باقی ریاستوں کے مقابلے عورت کو مارنا، اسکے ساتھ گالی گلوچ کرنا اور ایک مرد کے کئی ناجائز رشتے ہونے والے واقعات یہاں بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔

۲۱۔ اکتوبر۔ ۲۰۲۱

اکثر مشترکہ خاندانوں joint Families میں رہنے والے میاں بیوی میں جب کوئی تضاد پیدا ہوتا ہے تو کافی صورتیں نکل آتی ہیں ہ وہ تضاد خود بخود خاندان میں ہی حل ہو جائے۔

غیر مشترکہ خاندان Nuclear Family میں رہنے والے میاں بیوی کے بیچ میں جب کوئی ان بن ہوتی ہے تو نہ ہی معاملے کی تہہ تک جانے والا کوئی بچتا ہے اور نہ ہی آگ بجھانے والا۔ کبھی کبھی بڑے بزرگ بھی موجود نہیں ہوتے ہیں جن کی مہارت، تجربات اور حیا سے انسان نصیحت حاصل کرے۔

ایک اور بات بھی کہنا لازمی ہے کہ ہم لوگ سیکولر secular سماج کی اور بڑھ رہے ہیں جہاں ہم نے بزرگوں، سماج اور رشتہ داروں کے رول کو اپنی زندگی میں یکسر خارج کر دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم بہت سارے انتشار کے شکار ہو گئے ہیں۔ اللہ نے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی رو سے بہت سارے مشکلات کا ازالہ رکھا ہے

۔اور جب ہم سیکولر سماج کی اور بڑھ رہے ہیں ، ہم نے چھوٹی چھوٹی الجھنوں کو کورٹ کچہری میں کھڑا کر دیا ہیں جہاں پر وکیل اور جج صاحبان اپنی پروفیشنل زندگی گزار رہے ہیں ۔ اور ان کے بیچ میں جو بھی افراد ہیں۔ انہوں نے اپنی کارکردگی اور مشوروں کو تجارت بنادیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہاں مسلے حل نہیں ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی انسان کی پوری زندگی کو اضطراب میں ڈال دیتے ہیں۔

کاش ایسا ہوتا کہ ہم پھر اُن قدروں اور اُس سادگی کی طرف واپس لوٹ جاتے جو انسانی زندگی میں رحمت اور برکت سے کم نہیں تھیں۔

۱۱۔نومبر۔۲۰۲۱

ڈاکٹر عبدل کلیم جیسا مرد بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے جو اپنی بیوی سے ہمکنار رہنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی اسکو پیار بھی دینا چاہتا ہے۔ حالانکہ عمر کے آخری حصے میں انسان کو اپنے خاوند یا بیوی کا ساتھ ہونے کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔لیکن کچھ لوگوں کی سوچ بالکل مختلف ہوتی ہے۔اُن کا سوچنا ہے کہ آخری عمر میں ایک خاوند یا بیوی کو بنیادی سہولیات یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔

ڈاکٹر عبدل کلیم چونکہ اپنی بیوی سے الگ رہنا چاہتے تھے ۔اسلئے اسنے اپنی بیوی کے لئے پہلے سے ہی ایک مکان بنایا ہوا تھا اور اپنی دوسری بیوی کے لئے الگ ایک مکان میں منتقل ہونا چاہتا تھا۔وہ اسلئے کیونکہ اُسنے اپنی بیوی کو کبھی بھی اپنا رفیق نہیں پایا۔ جب ہم نے اسکی بیوی سے یہ سوال پوچھا تو اسنے اپنے خاوند کی غیر

شادی شدہ Extra-marital رشتوں کی بات کی۔ ہماری cdpo صاحبہ چونکہ ایک عورت ہے اُس نے جھٹ سے بول دیا کہ اگر تم نے اپنے خاوند کی خدمت اچھی طرح سے کی ہوتی تو یہ وقت تم کو دیکھنے کو نہیں ملتا۔بات چاہے جو بھی ہو لیکن ڈاکٹر کلیم ایک سمجھدار خاوند نکلا جو قانونی اور اخلاقی طور ہر محاذ پہ صحیح اُترا اگر چہ وہ دوسری شادی کر چکا تھا۔

۱۳۔ نومبر۔ ۲۰۲۱

فاطمہ فاروق نے خواہ مخواہ ایک مقدمہ ہماری سی ڈی پی او صاحبہ پر درج کیا۔ بقول اسکے ہم نے اس کے ساتھ زیادتی کی اور اس کو بہت طریقوں سے پریشان کیا۔ اس چیز کو مدِ نظر رکھکر ہم نے کورٹ میں حاضری دی جہاں پر یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ فاطمہ فاروق نے ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جیسے ہم اسکو پہلی بار ملے تھے۔

ہم لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ نہ جانے کیوں کچھ لوگ محکموں کے آفیسر صاحبان کو اپنا دشمن تصور کرتے ہیں حالانکہ ہمارے آفس میں جو بھی شخص آتا ہے ہم نے اس کو نہ صرف معقول توجہ کا مرکز بنادیا بلکہ قانونی اور اخلاقی طور اس کی تمام دفتری لوازمات کو پورا کرنا چاہا۔

پھر بھی کچھ لوگوں کو یہ احساس بار بار تنگ کرتا آرہا ہے کہ

سرکاری محکمہ میں تعینات افسر ہمیشہ انکے دشمن ہی ہو سکتے ہیں دوست نہیں ۔اس میں شاید اُن وکیل حضرات کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے جو اپنے موکل سے پیسہ بٹورنے کے نام پر ان کو محکمہ کے دشمن بناتے ہیں تا کہ ایک جنگ شروع ہو جائے جس میں ان کی صرف جیت درج ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ کہاں کیا پک رہا ہے۔

۲۷۔دسمبر۔۲۰۲۱

آج جج صاحب سے ملاقات ہوئی جس نے حاضری کے لئے آرڈر نکالا ہوا تھا۔کیس بہت سارے تھے، جج صاحب کو بہت ہی کم وقت ملتا ہے ہر ایک کیس کو سننے میں اور مجھے لگتا ہے کہ گورنمنٹ نے یہ صحیح قدم اٹھایا ہے کہ گھریلو تشدد کے سلسلے میں پہلے محکمہ سماجی بہبود کی رائے لینی پڑتی ہے جس سلسلے میں CDPO کو مدعو کیا جاتا ہے۔

جج کو غصہ تھا کہ ہم نے اسکے آرڈر کو نافذ نہیں کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیس تھا جہاں دو بھائی بہن کے بیچ میں کسی وراثت پہ تنازعہ پیدا ہو گیا تھا جو آپس میں چچازاد بھائی بہن تھے۔ہم نے جب کیس کی نوعیت کو دیکھا تو جان گئے کہ جائیداد کا مسئلہ ہے۔لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ دیکھنے کے بعد جج صاحب نے ہمیں کورٹ میں بذات خود حاضر ہونے کو کہا۔سب سے زیادہ دکھ

اس بات سے پہنچا کہ جج ہم پہ بہت بے رخی سے برس پڑا حالانکہ کورٹ کچہری میں واپس بولنے کا موقع کم ہی ملتا ہے اسلئے ہم بالکل چپ چاپ رہے لیکن بعد میں ہمیں جج صاحب نے اپنے چیمبر میں بلا کر بالکل اچھی طرح بات کی اور ہماری رائے اس کیس کے سلسلے میں مانگی۔ اُن کا کہنا تھا کہ کسی بھی کیس کو ذاتی زاویہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے حالانکہ ہم نے کبھی بھی ذاتی مفاد کو حاوی ہونے نہیں دیا۔

۱۲۔فروری۔۲۰۲۲

کیس ریاض بشیر نامی ایک وکیل نے کیا تھا۔جس نے اپنی شہرت کیلیئے ایک نیوز بنائی تھی جس میں لکھا تھا کہ سی ڈی پی او صاحبہ نے اس کے موکل کے ساتھ ذیادتی کی ۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس ایک مہینے سی ڈی پی او حلیمہ جی کے بیٹے کی شادی تھی اور میں بھی دعوت کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔جب تحقیقات ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ ایک نامور وکیل ریاض بشیر کی کارستانی تھی جو اپنی سستی شہرت کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ہمیں ریاض بشیر کے برتاؤ کا اتنا برا نہیں لگا جتنا یہ سیکھ ملی کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک وکیل اپنی شہرت بڑھانے کے لئے کس حد تک جاسکتا ہے اور ایک معزز آفیسر کو کیسے بدنام کیا جاتا ہے وہ بھی کوئی بھی خطا ہونے کے بغیر۔اس شیطانی امر میں کچھ نا اھل میڈیا والے بھی اس میں ملوث ہوتے ہیں ۔یہ سارا

کھیل اس لئے رچایا جاتا ہے کہ ایک کیس کو کسی نہ کسی طریقے سے سرخیوں میں نمایاں کیا جائے، آفسران پر زیادہ سے زیادہ دباؤ بنایا جائے جس کی وجہ سے وہ وکیل کے مدعی کے لئے وہی لکھے جو ایک وکیل کو چاہتا ہو۔

۱۸۔فروری۔۲۰۲۲

کچھ واقعات بالکل دل کو دہلانے والے ہوتے ہیں۔ نہ جانے کتنی اچھی لڑکیاں حالات کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ کشمیر میں شادی کا معاملہ دن بہ دن بہت مشکل ہورہا ہے۔ جب بھی ایک لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو اس لڑکی کے گھر والوں کی پوری زندگی کی جمع پونجی صرف اسی شادی پہ صرف ہوتی ہے۔ گاؤں میں تو لوگ اپنی زمین جائداد تک بیچنے کے لئے بھی مجبور ہو جاتے ہیں اور شہروں کی تو حالت ہی خراب ہے۔ چالیس سال کی عمر سے ہزاروں لڑکیاں تجاوز کر گئی ہیں اور ابھی بھی ان کے ہاتھوں پہ مہندی نہیں چڑھ پائی ہے۔ اگر اب کسی لڑکی کی شادی ہو بھی جاتی ہے خواہ وہ شہر ہو یا گاؤں تو جب اس کے سسرال میں تھوڑی سی بھی ان بن ہو جاتی ہے تو ماں باپ اور باقی رشتہ داروں کے لئے کسی المیہ سے کم نہیں ہوتا۔ مجھے میمونہ یاد آتی ہے جس نے حالانکہ بہت کم دفعہ ہمارے آفس

سے رابطہ کیا تاہم اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ کتنی ٹوٹی ہوئی اور زندگی سے ہاری ہوئی لڑکی ہے۔

اس کے رشتہ داروں سے مل کر یہ بھی ادراک ہوا کہ وہ کتنے شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ زندگی ختم ہوجاتی ہے اور پورے کا پورا خاندان ہی اضطراب اور بے چینی کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہ تو اللہ ہی کا کمال ہے کہ اب بھی ایسی لڑکیوں کی دماغی حالت برقرار ہے۔

۲۰۔فروری۔۲۰۲۲

اِرم جبار کی یہ بات سن کر دل کو بہت دکھ ہوا جب اس نے یہ بات کہہ دی کہ بھلے ہی اس کا خاوند اسے مکان کے دوسرے حصے میں منتقل کر دے لیکن وہ اپنا بیڈروم تبدیل نہیں کر سکتی۔ تھیرپسٹ Therapist کے لئے یہ ایک اہم نقطہ ہے جس سے وہ پھر اس رشتے کو جوڑ سکتا ہے۔لیکن ہمارے لئے یہ ایک بہت جذباتی جملہ تھا۔ جب ایک عورت ہر طرف سے بے بس ہو جاتی ہے، وہ شاید خاوند کو بھی چھوڑ سکتی ہے لیکن وہ اپنی یادوں اور خیالوں کو اپنے اندر اس طرح سمیٹے ہوئے ہوتی ہے کہ وہ اس کے دل سے شاید ہی کبھی نکل سکے کیونکہ اسے قدرتی طورا پنے وجود سے جذباتی رشتہ ہوتا ہے اور اس نے اپنی دنیا طے کی ہوئی ہوتی ہے، معین کی ہوتی ہے اور جب اسکا خاوند بے وفائی کرتا ہے وہ چاہے تو اسے رشتہ توڑ دے لیکن اپنے خوابوں خیالوں سے رشتہ نہیں توڑ سکتی۔

یہ ایک المیہ ہے جس کے بارے میں ہر ایک مرد اور عورت کو بچھڑنے سے پہلے سوچنا ہی پڑے گا اور خاص طور سے ایک ماں باپ کا کوئی بھی حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کے خوابوں اور خیالوں سے کھیلے۔

۲۵۔فروری۔۲۰۲۲

رحمت جیسی پڑھی لکھی خاتون بھی عشق کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک آوارہ اور منشیات سے آلودہ ایک کم عمر لڑکے سے شادی کرسکتی ہے۔اس بات کا بھروسہ نہیں ہورہا تھا لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ عشق اور جنگ میں سب جائز ہے۔

رحمت کشمیر کے ایک دور دراز ضلع سے تعلق رکھتی تھی ۔ وہ سرکاری نوکری بھی کرتی تھی ۔اس کی عمر قریباً 28 سال کی ہوتی ہے جب اس کو ایک نوعمر 19 سالہ ندیم نام کے لڑکے کے ساتھ عشق ہوجاتا ہے۔رحمت اس سے شادی کرنا چاہتی تھی ۔یہ سن کر اسکے گھر والے اسکے بہت خلاف ہوگئے اور اس سے سارے رشتے ناطے توڑنے پر تیار ہوگئے مگر محبت کا بھرم رکھتے ہوئے گھر والوں کی مرضی کے خلاف رحمت نے اس لڑکے سے شادی کرلی۔ایک سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک خوبصورت بچہ بھی عطا کیا۔لیکن رحمت کو جلد ہی اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اس لڑکے سے شادی کرنے کا اسکا فیصلہ کتنا غلط تھا کیونکہ اس کے خاوند نے اس کی

زندگی بالکل اجیرن بنائی تھی رحمت کا کہنا تھا کہ حالانکہ وہ سرکاری نوکری کر رہی تھی، اسکا خاوند ہر مہینے اس سے اسکی تنخواہ چھین لیتا تھا اور پھر اسے ایک ایک پائی کا محتاج بنا دیتا۔

رحمت نے چونکہ اپنی مرضی سے شادی کی تھی اسلئے اسکے گھر والوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا سوائے اُس کے چھوٹے بھائی کے جو اس سے بہت پیار کرتا تھا۔

ندیم کا ماما ایک سیاسی کارکن تھا اور اُس نے ان ساری چیزوں کا بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ بلکہ اسکے ماما نے تو خود اپنی بیوی کو بھی طلاق دے رکھا تھا۔ اسلئے ندیم نے اپنے ماما کی محبت اور اثر رسوخ کا خوب فائدہ اُٹھایا۔

کچھ مہینے گزرنے کے بعد ہی رحمت کے خاوند نے اسے گھر سے نکال دیا۔ ندیم کی ماں کا بھی طلاق ہو گیا تھا۔ اب رحمت کورٹ کچہری کے چکر میں اس قدر پھنس گئی تھی کہ وہ اپنے چھوٹے بچے کو بھی وقت دینے سے قاصر تھی۔ اور اوپر سے نوکری پر بھی غلط اثر پڑ رہا تھا۔ میں کبھی سوچتا تھا کہ خوب قیمت ادا کی رحمت نے سچی محبت کر کے شادی کرنے کی۔

۲۷۔فروری۔۲۰۲۲

میں نے کل محترمہ جج صاحبہ سے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ جتنے معاملات میں ہم نے عورت کو اُن کا حصہ دلایا وہ وہاں کبھی بھی رہنے کے لئے نہیں گئیں۔

اصل میں یہ رشتہ بہت حساس ہوتا ہے جو جذبات اور احساسات پر مبنی ہے۔ وقتی طور ہمیں یہ لگتا ہے کہ مکان اور جائداد کا لین دین شادی جیسے رشتے میں کافی اہمیت کا حامل ہے لیکن اصل میں اسکی روح ایک دوسرے کے ہم آہنگ سوچ پر ٹکی ہوئی ہے۔ ہماری تحقیق اور تجربہ تو یہی بتاتا ہے کہ قانون کی حرمت کو سمجھ کر جوں ہی حکمنامے نافذ کئے گئے ایک بھی عورت اس پر کھری نہیں اتری جب بھی شیرڈ ہاوس ہولڈ shared Household میں عورت کو حصہ دیا گیا، اُس نے یا تو کافی تاخیر کی یا اسکا جوش اور ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ کبھی بھی وہاں رہنے کے لئے نہیں گئی ہاں تالا لگا کر ضرور چلی گئی۔

یہ صریح ایک تلخ قول ہے لیکن حقیقت یہی ہے کیونکہ کتابوں اور نظریات theories میں جو باتیں بتائی جاتی ہیں کبھی کبھی عملی میدان

میں ساری کی ساری کھری نہیں اترتی۔ اس ضمن میں کہانیاں تو بہت ساری ہیں لیکن ایک نئ کہانی یہ ہے کہ سمیر جو پیشے سے ایک ڈاکٹر تھا، اپنی بیوی کی انا سے بہت تنگ آچکا تھا کیونکہ وہ ایک دیہاتی تھا جبکہ شائستہ شہر کی لڑکی تھی۔ دونوں میں شادی ہوئی جو ایک طے شدہ شادی Arranged marriage تھی۔ شادی اسلئے کرائی گئی تا کہ شائستہ کو رشتہ داروں کو دکھانے کے لئے ایک ڈاکٹر ملے جو شہر میں نایاب تھے کیونکہ شہر کے لوگوں کے پاس ڈاکٹر بننے کے ذرایع کم ہوتے ہیں اسلئے کہ شہری لوگ تجارت کو ہی اپنا پروفیشن بناتے ہیں۔

شادی کے کچھ برسوں بعد ہی دونوں میں ایسی ان بن ہوئی کہ دونوں ایک دوسرے کو طعنوں کا شکار بنانے لگے۔ جب بھی معاملہ صلح سمجھوتے پہ آیا چاہتا تھا، شائستہ اور اسکے گھر والوں کی انا بیچ میں آجاتی تھی اور معاملہ جوں کا توں رہ جاتا تھا۔ آخر کا جب عدالت تک بات آ پہنچی تو مجسٹریٹ نے شائستہ کو ایک الگ گھر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب ہم نے اسکا انتظام ڈاکٹر آصف کے ہاتھوں سے کرانا چاہا اسنے تو ایک دم حکم نامے کو تسلیم کیا لیکن آج تک شائستہ اس گھر میں رہنے کے لئے تو کیا دیکھنے تک نہ گئی۔

۳۰۔فروری۔۲۰۲۲

وہ ایک بیمار طبعیت کی لڑکی تھی۔ جب بھی خاونداس سے اپنے حقوق کی طلب کرتا وہ یہ ٹال کر منع کرتی کہ آج اُس کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔اُس کا خاوند ایک ہشاش بشاش طبعیت کا مالک تھا جسکو زندگی جینے کا بہت شوق تھا اور ظاہراً جب ایک انسان کی شادی ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی باقی زندگی کی خوشیاں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ بتائے اگر وہ ایک اچھے قسم کا انسان ہوگا۔لیکن کوثر اس چیز کے بالکل منافی کرتی یا وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ وہ بیمار ہے۔

نہ جانے اس کی طبعیت میں کیا تھا کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بات کا بہانہ بنا کر خاوند کی باتوں کو یا تو ان سنا کرتی یا پھر ٹال دیتی۔ یہاں دو چیزیں یادرکھنی بہت ضروری ہے۔ایک تو یہ کہ مرد اور عورت کی نہ صرف بناوٹ میں فرق ہوتا ہے بلکہ ان کی سوچ میں بھی کافی زیادہ انتر ہوتا ہے۔مرد اگر آزاد خیال کا مالک ہوتا ہے تو عورت کی طبعیت میں بچپن ہی سے سنجیدگی ہوتی ہے۔اس چیز کو ایک کامیاب

رشتہ بنانے کے لئے سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت دونوں کا ایک ماضی ہوتا ہے یا ماضی میں اپنے گھر کی کچھ الجھنیں ہوتی ہے۔ اُس ماضی اور اُن الجھنوں کو اگر بیچ میں نہ ہی لایا جائے تو رشتے کو کافی حد تک کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔

کوثر کی بے رخی میں ایسی ہی کچھ چیزیں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ یا تو ماضی کی کچھ پریشانی میں الجھی ہوئی تھی یا تو وہ من ہی من کسی جسمانی کمزوری میں مبتلا تھی جس کا ذکر وہ کسی سے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اصل میں وہ اپنے والدین کے گھر کی پریشانیوں میں لگی ہوئی تھی۔ بہت بار ایسا دیکھا گیا ہے کہ عورت اپنے والدین کے ساتھ ہمیشہ رشتہ استوار رکھتی ہے اور جو اسکے والدین نسبتی کے لئے نقصان کا باعث تو ہے ہی سماج کے لئے بھی بہت نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔

۳۔مارچ۔۲۰۲۲

عائشہ کے خاوند کا کہنا تھا کہ جب سے عائشہ کی شادی ہوئی وہ تب سے اسی فکر میں ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو کیسے بتائے کہ اسکا خاوند عابد صرف ایک نجی ڈینٹل کلینک چلاتا ہے نا کہ ایک سرکاری ڈاکٹر ہے جو اس نے اپنے خاندان میں بتایا تھا۔ حالانکہ عابد کی غیرت کو یہ قطعی منظور نہیں تھا مگر کسی وجہ سے کافی دیر تک وہ اپنی بیوی کے کہنے پر عمل کرتا رہا مگر ایک وقت وہ بھی آیا جب اسکی غیرت جواب دے گئی اور ایک دن ہمت کر کے اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اس کے رشتہ داروں سے اب کوئی بات نہیں چھپائے گا۔ بس یہی کہنا تھا کہ عائشہ او عابد کے درمیان ان بن شروع ہو گئی اور نوبت طلاق تک آ پہنچی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم شادی کے معاملے میں بہت ساری باتیں چھپاتے ہیں جو بعد میں پتہ چلتی ہیں اور انہی باتوں کا بعد میں

نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ جو خوبصورت رشتہ دونوں میاں بیوی نے بنایا ہوتا ہے اسکو ٹوٹنے میں پل بھر نہیں لگتا اور زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ نا تو شادی سے پہلے کوئی بات چھپانی چاہیئے اور نا ہی شادی کے بعد۔ جس کو آپ قبول ہونگے وہ کسی بھی صورت میں کسی بھی سطح پر آپکو قبول کرے گا۔

۵۔ مارچ۔۲۰۲۲

ایک جگہ عرض نویس کے پاس بیٹھ کر مجھے اس چیز کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ جو بھی وہاں آیا اُس کو کوئی نہ کوئی درخواست لکھانی تھی۔ کسی کو اپنے داماد کے خلاف جس نے اس کی بیٹی سے شادی تو کی لیکن بچہ پیدا ہونے کے بعد ہی اسکو میکے میں چھوڑ دیا اور کہیں گم ہوگیا۔ عرض نویس کے پاس ان لوگوں کی بھی کم تعداد نہیں تھی جو اپنی بیوی اور بالغ بچوں کے ساتھ کئی برس رہ کر بھی کسی دوسری عورت کے ساتھ بھاگ گئے۔ یہ ساری مثالیں اس چیز کی عکاسی کرتی ہیں کہ عورت کس حد تک ہمارے سماج میں لاچار، بے بس اور کمزور ہے۔ ہاں اِس بھیڑ میں کچھ ایسے مرد بھی کھڑے تھے جن کی بیوی کسی غیر مرد کے ساتھ بھاگ گئی اور اپنے بچوں کو باپ کو تھوپ کر رفو چکر ہوگئی۔

یہ سب چیزیں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ اگر چہ مرد اور عورت کے بے شمار گونا گوں مسائل ہیں تاہم گھریلو فساد دونوں کی

زندگیوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے اور جب کہ دونوں اس طوفان سے جھوج رہے ہیں تاہم اگر ہماری تہذیب کی بات کی جائے تو عورت اس سیلاب میں تن تنہا دھکے کھا رہی ہے۔

۹۔ مارچ۔۲۰۲۲

میں چونکہ ایک مرد ہوں تو یہ ڈائری پڑھ کر کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ میں نے عورتوں کے خلاف کچھ باتیں ضرور کہیں ہونگی۔ میں چونکہ ایک سماجی ماہر بھی ہوں اسلیئے مجھے اس بات کی کافی فکر رہتی ہے کہ اصل میں خرابی کہاں پر ہے۔ مجھے آج اس بات نے کافی جھنجوڑا کہ کس طرح عورتوں کو گھر بسانے کی سزا مل رہی ہے۔ وہ چاہے کورٹ کچہری کا چکر ہو یا کسی ڈاکٹر یا طبیب کے پاس جانا۔ عورت ہر سطح پر پس رہی ہے۔

جج صاحبہ نے آج مجھے بتایا کہ کس طرح وہ خود اس بات پر غور کر رہی ہے کہ جب عدالت میں ایک عورت کفالت maintenance لینے کے غرض سے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک دودھ پیتا بچہ بھی ساتھ ہوتا ہے۔ اگر ماں کو ۳ گھنٹے انتظار کرنا پڑے تو ظاہر ہے کہ اُس کا دودھ پیتا بچہ بھی ۳ گھنٹے کورٹ میں ہی کاٹے گا۔ دوسری طرف اس کا خاوند کہیں مزے کی زندگی بسر کر رہا ہوگا اور ایک بات یہ بھی ہے کہ عورت کو بچے کو دودھ بھی پلانا ہے۔ وہ کہاں پلائے گی، کیسے پلائے گی۔ یہ ایک لمحہ فکر ہے ہم سب کے لئے۔

۱۳۔ مارچ۔ ۲۰۲۲

ہمارے سماج میں بہت سارے ایسے مرد حضرات ہیں جو طلاق دے کر شریک حیات جیسے عظیم رشتے کو ایک بوجھ سمجھ کر ہمیشہ کے لئے اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں لیکن انکا یہ اندیشہ کہ وہ ہمیشہ کے لئے طلاق کے بعد سکون کی زندگی بسر کر پائیں گیں بالکل بے بنیاد ہیں کیونکہ جو انسان کسی رشتے سے بھاگتا ہے وہ درصل خود سے ہی بھاگتا ہے۔ یہ علم نفسیات بالکل واضع کر گئی ہے حالانکہ مذہب نے طلاق کو جائز قرار دے کر انسان کو ایک بے بسی سے بچایا ہے جس کے پیچھے کچھ ایسے عناصر کارفرما ہو سکتے ہیں جو محور انسانیت کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ انسان چھوٹی چھوٹی باتوں میں خود کو الجھاتا رہے اور پھر اسے طلاق ہی کا راستہ دکھائی دے۔ اگر ایسا ہی ہے تو میرا کہنا یہی ہے کہ طلاق سے انسان اپنے ہی نفس سے بھاگنا چاہتا ہے اور بھلا آج تک نفس سے کون بھاگ سکا ہے۔ شاید مرنے کے بعد بھی نہیں۔

۲۰۔ مارچ۔۲۰۲۲

اُس کی ماں نے اپنے خاوند کے ساتھ زندگی کے حسین دن گزارے تھے۔ اپنا سونا، زیورات وغیرہ بیچ کر ایک خوبصورت مکان بنا کر اپنے دونوں اولادوں میں بلاتفرق بانٹ دیا تھا۔ جوں ہی خاوند گزر گئے، بیٹے پر اپنی ماں بھاری لگنے لگی۔ بیٹا خود کو ایک پڑھا لکھا نوجواں تصور کرتا تھا۔ جب ہم نے اس سے بات کی وہ ہر بات پہ یہی بار بار کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنے ایم۔ ایس۔ سی میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ لیکن ماں کے ساتھ اسکی رنجش اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسکے شعور پہ یہ بات عیاں ہی نہیں ہو پاتی تھی کہ وہ بات بات پر لفظ ذلیل اپنی ماں جیسے عظیم نام کے استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کر پا رہا تھا۔ جب ہم اسکے گھر میں داخل ہوئے اور اسکی دل خراش باتیں سنیں تو ہم نے اسے کافی بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ چاہے تو کیس کو آگے لے جا سکتا ہے لیکن برائے مہربانی ماں کو بھلا برا اور کھری کھوٹی سنانے سے پرہیز کرے لیکن اسنے کسی بھی

قیمت پر اپنی زبان کو نہیں سنبھالا۔ بعد میں ہم لوگوں نے یہی تصور کیا کہ اس کے پاس بھلے ہی گولڈ میڈل پڑھائی کے میدان میں ہو لیکن عملی اور اخلاقی زندگی میں وہ ایک پڑھے لکھے جاہل سے کم درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بعد میں کافی دیر سوچتا رہا کہ ہمارے سماج میں بہت سارے ایسے نوجوان ہیں جو کافی پڑھے لکھے ہیں لیکن اخلاقی طور سے وہ اتنے گرے ہوئے ہیں کہ جب وہ زبان کا زہر کسی کے کانوں میں گھول دیتے ہیں تو وہ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ کہیں زبان کے تیر ان کی ماں کی چھاتی کو چھلنی تو نہیں کر رہے ہیں جس ماں سے انہوں نے شیر وشکر پیا ہو۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ سننے والی انکی بہن، بیٹی یا شریک حیات ہے جس کی زندگی پر ان کا پورا اختیار ہے اور جو صنف نازک ہیں۔

۲۷۔ مارچ۔ ۲۰۲۲

میں نے آج اُس آنگنواڑی ورکر سے پوچھ ہی ڈالا جو مجھے ہمیشہ فون کرتی تھی کہ اسکی تنخواہ کیوں نہیں آئی کہ وہ اپنی تنخواہ کی اتنی فکر کیوں کرتی ہے۔ 'ایک نہ ایک دن تو آ ہی جائے گی'۔ بس میرا یہ کہنا تھا کہ اس کی آنکھوں سے برسات کی طرح آنسوں بہنے لگے۔ وہ بولنے لگی ''جناب مہینے کے درمیانی دنوں سے ہی میرے سسر جی آنگن میں ڈنڈا لے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ میری تنخواہ آگئی ہے کہ نہیں۔ جب میں نہیں بولتی ہوں تو وہ مجھے بہت مارتے ہیں''۔ مجھے یہ بات سن کر ذاتی طور پر بہت حیرت ہوئی۔ جب میں نے اس بے ہودگی کی وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ اس کے خاوند کی نوکری 2014 کے تباہ کن سیلاب میں چلی گئی تھی تب سے وہ ڈپرشن میں مبتلا ہے اور گھر میں بیٹھ کر صرف سگریٹ پھونکتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بچوں کی دیکھ بال، گھر گرہستی کی ساری ذمہ

داریاں، بچوں کی فیس اور ساس سسر کے سارے خرچے ربینہ ہی چلا
تی تھی جو ایک آنگنواڑی ورکر تھی اور جس کی تنخواہ پانچ ہزار سے زائد
نہیں تھی۔ اس پر مصیبت یہ کہ تنخواہ کئی مہینوں کے بعد ہی واگزار کی
جاتی تھی۔ ہمارے سماج میں آج بھی ربینہ جیسی عورتیں موجود ہیں
جو گھر کے سارے خرچے خود چلاتی ہیں۔ باہر کی دوڑ دھوپ کر کے
جب وہ تھکی ہاری گھر واپس لوٹتی ہیں تو ان پر طعنوں کی بارش سے خیر
مقدم کیا جاتا ہے جو اندر ہی اندر ان کی تمناوں، آرزوں اور خوشیوں
کا قتل عام ہے۔ یہاں پر نا کوئی مذہب انجمن اور نا ہی غیر سرکاری
انجمن ان کا درد سمجھ سکتی ہیں۔

۴۔اپریل۔۲۰۲۲

دلشادہ کے خاوند نے بینک سے قرضہ لے کر دلشادہ کی زندگی کو اجیرن بنایا تھا۔دلشادہ سماجی بہبود محکمے میں ایک خادمہ (Helper) کا کام کرتی تھی جس کی تنخواہ فقط ماہانہ پچیس سو روپیہ تھی۔اکثر ہلپروں کی تنخواہ چھ یا سات مہینے کے بعد ہی آتی ہیں۔آج جب دلشادہ کو چھ مہینے کے بعد اکیس سو روپیہ لینے تھے اسکی ساری تنخواہ بند ہوگئی۔وہ اسلئے کیونکہ اسکے خاوند نے اسے بھی ایک گارنٹر بنایا تھا اور بچاری دلشادہ نے تب سے کوئی تنخواہ نہیں لی تھی جب سے اسکے نکمے خاوند نے قرضہ لیا تھا۔دوسری جانب جوئے اور شراب نوشی کا عادی اسکا خاوند اکثر باہر رہتا تھا اور دلشادہ کو قرض وصولنے آئے تمام اشخاص کا صبح سویرے سے ہی منہ دیکھنا پڑتا تھا جو اسکی جانب گھورتی ہوئی نظروں سے تعاقب کرتے۔پتہ نہیں دلشادہ کے کون سے گناہوں کی یہ سزا تھی۔

۸۔اپریل۔۲۰۲۲

آپ بیوی کے ساتھ طلاق تو کرنا چاہتے ہے لیکن کیا طلاق جیسی چیز آپ کی انا کو مطمئن کر سکے گی۔ جواب تو ایک مرد ہاں ہی میں دے گا لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ طلاق کے بعد جس عورت سے وہ شادی کرتا ہے وہ عورت بھی اپنے حقوق کی پاسداری کی مستحق ہوتی ہے اور اگر ایک مرد پہلی بیوی کے حقوق پامال کرے گا تو اس مرد سے کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ دوسری عورت کے حقوق بجا لانے میں کارفرما ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے محلے میں ایسے ایک مرد کو بھی دیکھا ہے جس نے اس عورت کو طلاق دی جو بہت رفیق و شفیق تھی اور جسکی شرافت کے گیت پورا محلّہ گاتا تھا لیکن جوں ہی اس مرد نے دوسری شادی کر کے اپنی بیوی کو گھر لایا تو بہت سارے گھرانے اسکی بیوی کے شر سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور وہ مرد ہمیشہ کے لئے اندھیروں کے بھنور میں ڈوب گیا۔

۲۹۔اپریل۔۲۰۲۲

ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ کچھ چیزیں گھر کو توڑنے میں ایک اہم رول ادا کرتی ہیں جیسے کہ:

ا۔ میاں بیوی کے معاملات میں دوسرے لوگوں کا ٹانگ اڑانا۔

۲۔جائداد کو دیکھ کر نکاح جیسا پاکیزہ رشتہ تجویز کرنا۔

۳۔قوت برداشت کی کمی ہونا خاص کر ایک عورت میں۔

۴۔اپنی شریک حیات سے زیادہ اپنے رشتے کے بارے میں دوسروں سے سننا اور انہی کی رائے پر عمل کرنا۔

۵۔میاں بیوی کی آپسی گفتگو بالکل بند ہونا یا کم ہونا۔

۶۔اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو نظر انداز کرنا۔

۷۔شریک حیات سے ملی ہوئی چھوٹی خوشیوں کو بالکل فراموش کر دینا۔

۸۔اپنے جیون ساتھی کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو بالکل بُھلا دینا اور ان لمحات کی قدر نہ کرنا۔

۹۔اپنی بیوی کو مارنا یا ایسے طعنے دینا جو برداشت سے باہر ہو۔

۱۰۔اپنی شریک حیات کی کمزوریوں کو سرِ عام اُچھالنا۔

۱۰۔مئی۔۲۰۲۲

کتنا خوشحال ہے وہ گھر جہاں لوگ امن سے دو وقت کی روٹی کھاتے ہیں۔اور کتنے کامیاب ہیں وہ اشخاس جو ہزاروں رکاوٹوں ، ہزاروں خامیوں اور ہزاروں فرق ہونے کے باجود بھی ایک گھر اور ایک چھت کے نیچے رہتے ہیں۔کم پہ توکل اور زیادہ رزق ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ایک دوسرے کی خامیوں کو اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں نا کہ راستے پہ لاتے ہیں اور نا ہی مذاق اُڑاتے ہیں۔اپنے بچوں کو خوشحال زندگی دینے کے لئے متمنی ہیں اور ان کی تربیت کا بیڑا اٹھا کر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور کتنا بدترین ہے وہ گھر ،شاید ہر برکت سے خالی جہاں بات بات پر لڑائیاں ہوتی ہیں۔طعنہ بازی اور کینہ پروری کی قندیلیں روشن کی جاتی ہیں۔لالچ اور حرس جیسی برائیاں سر چڑھ کر بول رہی ہیں۔جہاں کی دیواریں امن کے بجائے آگ برسا رہی ہو۔وہ آگ جو شاید جہنم کی آگ سے بھی بڑھ کر ہے۔

۲۰۔مئی۔۲۰۲۲

ہم کب تک قاضی اور عدالت کی چوکھٹ تک گھر کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو پہنچاتے رہیں گے۔ کیا ہم ہمیشہ قوانین کا سہارا ہی لیں گے یا گُتھی کو سلجھانے میں اپنی سمجھ، انسانی قدریں اور اللہ کی دی ہوئی صلاحتیں جو اس نے دو انسانوں کے باہمی رشتہ کو استوار کرنے کے لئے عطا کی ہیں انکو کام لا کر گھر کو بکھرنے سے بچائیں گے۔ کیا ملک کے نئے قوانین جو اب ہماری ریاست میں بھی نافذ کئے گئے ہیں کا سہارا ہی ہمارا آخری سہارا ہے۔ میری نظر دیکھ رہی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو شاید بڈ روم میں ہی سلجھائی جا سکتی تھیں راستے کی زینت بنتی جا رہی ہیں۔ ہمارے یہاں درجنوں کیس ایسے ہیں جہاں پہلے پہلے میاں بیوی کو یہ گماں تھا کہ اب شاید آسمان سے ابابیل اتر کر ان کی زندگی کو بدل دیں گے لیکن بعد

میں وقت کے بھنور سے گزرتے گزرتے پنچھی تھک کر نیچے گر گئے اور پچھتاوے کے بغیر کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ چاہے آپ گھریلو تشدد کے معاملے کو بڑی سے بڑی عدالت تک بھی لے جائیں آپ کو اپنے شریک حیات کے ساتھ ایک بار بیٹھ کر اپنے برتاؤ کو تبدیل کر کے اخلاق اور ندامت کی چادر کا سہارا لے کر بیچ کی کدورت کو صاف کرنا ہی ہوگا۔

(ختم شد)



گھریلو تشدد کی ابتداء بچپن سے ہی ہوتی ہے۔ جب ہمارے نونہال ابھی زندگی کی بہار سے آشنا بھی نہیں ہوتے ہیں، ہم لڑکے کے ہاتھ میں کھلونے کے بطور بندوق جیسا کھلونا اور لڑکی کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھما دیتے ہیں تا کہ لڑکے کی برتری اور بڑائی ظاہر ہو اور لڑکی کی بے بسی بھی سب کی سمجھ میں آئے کیونکہ بندوق سے تو ہمیشہ خوف ہی کھایا جاتا ہے جبکہ گڑیا سے نرمی اور انکساری کی ہی شناخت ہوتی ہیں۔

(اسی ڈائری سے)

دنیا کے ہر مذہب میں عورت کو جو حقوق دیے گئے ہیں اُن سے ہم ہمیشہ منہ موڑتے رہے ہیں اور عورت کو وہ حقوق نہیں ملتے ہیں جن کی وہ حقدار تھی، زمانہ جدید میں بھی عورت ان حقوق سے کوسوں دور ہے۔ بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ اس میں تعلیم یافتہ طبقہ بھی شامل ہے جو بڑی بڑی ڈگریاں لے کر بھی آج تک عورت کے حقوق سمجھ نہیں سکے۔

شازیہ منظور
ایچ، او، ڈی، محکمہ سماجی خدمات کشمیر یونیورسٹی


978-93-90819-70-6

